دسمبر 58

رجسٹر نمبر ایل ۵۳۴۰

جلد ۵۱ | عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۱	بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۸ء	عدد ۳

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن۔ اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

ایک انسان جب کبھی عالم خیال میں دنیا کی سرحد کے اُس پار جھانک کر اُس راستہ کو دیکھتا ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے تو کانپ جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ آخر وہ منزل کس قدر کٹھن اور دشوار ہوگی۔ اُس پر سے گذرتے ہوئے کتنی زیادہ احتیاط کی ضرورت پیش آئے گی۔ ذرا سا توازن بگڑنے سے آدمی کس خوفناک گڑھے میں گریگا اور پھر وہاں اُس کا کیا حشر ہوگا؟ یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں خیالات صرف اس ایک تصوّر کے ساتھ ذہن میں گھومنے لگتے ہیں اور آدمی ان پر گھنٹوں غور کرتا ہے مگر بالآخر معاملہ اس ایک نقطہ پر آکر ختم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے بغیر ان مراحل میں سے کوئی شخص بھی کامیابی کے ساتھ نہیں گذر سکتا۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ کیا اس عالم ناسوت میں بھی کوئی منزل ایسی ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہ سہی مگر خطرات اور مشکلات کے نقطۂ نظر سے "صراط" سے ملتی جلتی ہے تو اسے آسانی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ راہ تجدید و احیائے دین کی راہ ہے۔ یہ کام بڑا ہی مشکل اور صبر آزما ہے اسکی ذمہ داریاں بڑی ہی شدید اور نازک ہیں۔ اس میں قدم قدم پر انتہائی حزم درکار ہوتا ہے اور توازن میں اگر معمولی سا فرق آجائے تو آدمی تجدید دین کی بجائے تخریبِ دین کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آدمی جب کبھی اس کام کا تصور بھی کرتا ہے تو کانپ جاتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ جو لوگ اس راہ میں کامیاب و کامران ہوئے ہیں اُن پر رحمت باری سایہ فگن رہی اور صرف اسی ذات کے سہارے سے ان منازل کو طے کر گئے ورنہ یہ کام انسان کے بس سے باہر ہے۔

ممکن ہے یہاں ایک سوال انسان کے ذہن میں یہ پیدا ہو کہ جب اللہ کا کلام اور اُس کے رسولؐ کی سنت ہمارے پاس محفوظ ہے اور خلفائے راشدین اور دوسرے ائمہ اور صلحائے امت کے پورے کارنامے ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں تو پھر اس کام کو اتنا کٹھن اور مشکل کیوں کہا جاتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب الٰہی اور سنت رسولؐ کی موجودگی اور صحابہ کرامؓ اور ملت کے دوسرے پاکباز لوگوں کی سیرت و کردار کا صحیح ریکارڈ ہمارے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہے، اور اس لیے ہم دینی اعتبار سے اُس طرح کبھی بھی مفلوج نہیں ہوئے جس طرح کہ یہودی اور عیسائی، اور ایشیا کے دوسرے مذاہب کے پیرو مفلوج ہو کر رہ گئے۔ یہ بلاشبہ اسی نعمت کا اعجاز ہے کہ دین کے ساتھ ہمارا رشتہ ہماری ساری کوتاہیوں کے باوجود ہمیشہ قائم رہا ہے اور ہم نے آج تک دوسرے مذاہب کے علمبرداروں کی طرح اپنے دین کو قصۂ پارینہ یا ماضی کی ایک مقدس یادگار یا ایک آنجانی یا انہونی چیز کی حیثیت سے نہیں دیکھا بلکہ اسے ہمیشہ ایک رہنما قوتِ فکر و عمل تسلیم کیا ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ بالکل بجا اور درست، لیکن ان کے ماننے کے باوجود اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وقت کے فتنے بھی کوئی کم خطرناک نہیں ہوتے۔ ان کا طوفان لوگوں کے فکری جہاز کو بے لنگر کردیتا ہے اور اسے اعتدال اور توازن کی راہ پر لانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ جب کسی اُمت یا ملت کے دماغ پر زمان و مکان کے تقاضے اس طرح مسلط ہوجائیں کہ اُسے ان کے علاوہ کوئی چیز بھی سمجھ میں نہ آتی ہو، ان حالات میں اُس کے فکر و نظر کو زمان و مکان کی جکڑبندیوں سے آزاد کرکے اسے اسلام کے عالمگیر اور سرمدی پیغام کا علمبردار بنانا بہت ہی کٹھن منزل ہے یہ کام انتہائی مشکل اور پیچیدہ ہے جب تک ایک انسان اس کام کی مشکلات اور پیچیدگیوں سے کماحقہٗ واقف نہیں ہوتا وہ احیائے دین کی نازک ذمہ داریوں کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ وقتی مصلحتیں اور وقتی مطالبات کوئی ایسی چیزیں نہیں جنھیں آسانی سے نظر انداز کیا جاسکتا ہو۔ ان کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے اور اس سے نجات دلانے کے لیے کسی فرد یا گروہ کو زبردست جد و جہد کرنا پڑتی ہے۔

پھر اس معاملہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وقت کے فتنے بہت سی مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں ان میں ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ سوسائٹی کی فضا بحیثیت مجموعی پاکیزہ ہو۔ ملت کی اکثریت پر دینی اثرات نہایت

گھرے ہوں صرف چند مفسد اور شریر انسان بعض ایسے افکار کی اشاعت شروع کر دیں جن سے فضا کے بگڑنے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ ایسے ماحول میں دین کے علمبرداروں کا کام زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ ان کا فرض صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ وہ ان غلط افکار اور باطل نظریات کی اس طریق سے تردید کریں کہ عوام پر ان کی لغویت واضح ہو جائے۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ معاشرہ تو ہر لحاظ سے صحت مند اور توانا ہو مگر اس میں ایک محدود طبقہ اپنی عیاریوں اور چالاکیوں سے مسندِ اقتدار پر قابض ہو جائے اور قوت اور طاقت کے بل بوتے پر لوگوں کو غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کرے۔ یہ صورت پہلی صورت سے نسبتاً زیادہ مشکل ہے۔ اقتدار کا یہ خاصہ ہے کہ اگر وہ بُرا ہے تو مقناطیس کی طرح سماج کی ساری برائیوں کو اپنے ارد گرد سمیٹ کر ایک زبردست قوت بن جاتا ہے جسے روکنے کے لیے بسا اوقات جان تک کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ لیکن یہاں بھی دین کے جاں نثاروں کی ہمت بندھانے کے لیے بیشمار عوامل موجود ہوتے ہیں۔ انہیں اس بات کا ہر قدم پر احساس رہتا ہے کہ انہیں اکثریت کی تائید حاصل ہے۔ پھر وہ لوگ اس بات کا بھی پوری طرح شعور رکھتے ہیں کہ اگر معاشرہ پر سے اس مفسدانہ اقتدار کے تسلط کو ختم کر دیا جائے تو پھیلی ہوئی برائیاں خود بخود دفع ہو جائیں گی کیونکہ ان برائیوں کو ابھی سوسائٹی میں جڑ پکڑنے کا موقع نہیں ملا۔

احیائے دین کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہاں پیش آتی ہے جب برائیاں معاشرہ کے اندر پوری طرح نفوذ کر چکی ہوں، جب غلط افکار و نظریات سے لوگ نہ صرف مرعوب ہی ہوں بلکہ مغلوب بھی ہو چکے ہوں اور وہ طبقہ جسے ملک کی فکری رہنمائی کا منصب حاصل ہو وہ ان باطل عقائد کی ترویج و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصدِ وحید قرار دے لے۔ پھر اس طبقہ کی پشت پر حکومت کے وسائل بھی موجود ہوں اور ریاست کی قوتِ قاہرہ ان باطل نظریات کی بنیاد پر عملاً ایک سوسائٹی کی تشکیل کرنا شروع کر دے۔ ایسے کٹھن حالات میں اعلائے کلمۃ الحق بڑا ہی صبر آزما کام ہے۔ ان بستیوں میں جہاں رات ابھی اپنے پر پھیلا رہی ہو ہدایت کے دیئے جلانا بلاشبہ ایک قابلِ قدر کام ہے لیکن ایک ایسا ماحول جس پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا چکا ہو اور

لوگ اس تاریکی پر نہ صرف مطمئن ہوں بلکہ بدقسمتی سے وہ اسے روشنی سمجھ رہے ہوں اور اس کو دور کرنے کی ہر کوشش اُن کے نزدیک مذموم خیال کی جائے، پھر وہاں مخالفت کے زبردست طوفان اور مخاصمت کی تند و تیز آندھیاں بھی چل رہی ہوں، وہاں شمعِ ہدایت روشن کرکے پورے ماحول کو اس کی ضیا پاشیوں سے مستفید کرنا ایک زبردست خدمت ہے۔ اور یہ خدمت جتنی زیادہ قابلِ ستائش، جتنی زیادہ خدا کے ہاں اجر کی مستحق ہے، اُتنی ہی اس کی ذمہ داریاں نازک ہیں اور اس جدوجہد میں بھٹکنے کے خطرات بھی زیادہ ہیں۔

اوپر کی سطور میں جن مختلف صورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اُن میں کوئی تاریخی ترتیب تلاش کرنا بالکل بے سود ہے۔ جس طرح علم الاقتصاد کے ماہرین نے پوری انسانی تاریخ کو طریقِ پیدائش کے اعتبار سے مختلف ادوار میں منقسم کر دیا ہے، اسی طرح کی کوئی تقسیم تجدید و احیائے دین کے معاملے میں ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے دو تین سو سال بعد کسی ملک میں تیسری صورت درپیش ہو اور اس کے ہزار سال بعد احیائے دین کی کوشش کرنے والوں کو پہلی یا دوسری قسم کی صورتوں کے مسائل گھیرے ہوئے ہوں۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ اب جو لوگ دین کی سربلندی کے لیے کوشاں ہیں چونکہ انہیں نسبتاً مشکل حالات سے سابقہ پیش آ رہا ہے اس لیے اُن کا مرتبہ بھی زیادہ بلند ہے، صحیح نہیں۔ جو شخص تلاطم خیز سمندر کی تند و تیز موجوں سے نبرد آزما ہو اس کے مصائب کا صحیح اندازہ اُس کے علاوہ اور کسے ہو سکتا ہے؟ اسی طرح ایک عہد یا ایک ماحول میں اقامتِ دین کے کام کرنے والوں کی دقتوں کو اس عہد اور اسی ماحول کے رہنے والوں کے سوا کوئی دوسرا پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ماحول اور دوسرے ماحول میں جو فرق پایا جاتا ہے اُس کی اساس محض افکار و نظریات کا اختلاف نہیں ہوتی بلکہ اس میں جذبات و احساسات بھی برابر شریک ہوتے ہیں۔ کسی قوم کے معتقدات بلاشبہ اُس قوم کے ذہنی اور فکری سانچے تیار کرنے میں بہت بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور ان کی اثر آفرینی کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن جو چیز افراد کو ان سانچوں میں ڈھلنے پر آمادہ کرتی ہے وہ جذبہ اور احساس ہے۔ حیاتِ انسانی جو "شعلۂ مستور" افراد کے دل و دماغ کو پگھلا کر ان میں قبولیت کی صفت پیدا کرتا ہے۔ اس کی کیفیت جس طرح افراد کے معاملہ میں داخلی ہے

اسی طرح ماحول کے معاملہ میں بھی سراسر اضافی ہوتی ہے اور باہر کا کوئی فرد جب تاریخ کی چلمن میں سے جھانک کر دیکھتا ہے تو اس کی نگاہ میں افکار و نظریات تو آجاتے ہیں لیکن ان افکار و نظریات سے وابستگی کی کیفیات اُس کی آنکھوں سے ہمیشہ اوجھل رہتی ہیں اور اس بنا پر وہ دوسروں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔

اگر ہر عہد کی جاہلیت محض فکر و نظر کی غذا تک دوسرے عہد کی جاہلیت سے مختلف ہوتی تب بھی اس سے لڑنے کے ہتھیار کبھی ایک سے نہ ہو سکتے تھے لیکن جہاں یہ اختلاف افکار و نظریات سے گذر کر جذبات و احساسات تک پہنچ گیا ہو وہاں ان ہتھیاروں میں یکسانیت تلاش کرنا بالکل عبث ہے۔ جس طرح ہر دور کی گمراہی مخصوص فتنوں کے ساتھ حملہ آور ہوتی ہے اسی طرح اس سے نپٹنے کا طریق بھی بدلتا رہتا ہے کیونکہ حملوں کی نوعیت کے بدلنے سے ان کی مدافعت کی نوعیت کا بدلنا ناگزیر اور لابدی ہے اور اگر یہ تبدیلی نہ کی جائے تو کامیابی کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں۔

جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بلکہ ہمارے ہاں کا سارا علمِ کلام اور ہمارے ائمہ اور صلحاء کی تجدیدی کوششیں اس حقیقت کی شاہد ہیں۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے اصلاحِ حال کے لیے جو جدو جہد کی اور اموی درباروں میں بڑھتے ہوئے جاہلی رجحانات و اثرات کا جن مختلف طریقوں سے مقابلہ کیا اُن کا انداز امام غزالیؒ کے کام سے الگ اور جداگانہ ہے۔ اسی طرح مجدد الف ثانیؒ کے تجدیدی کارناموں اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی اقامتِ دین کی کوششوں میں گو نوعی فرق نہ سہی لیکن عملی فرق ضرور پایا جاتا ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ جاہلیت ہر عہد میں فتنوں کے رنگا رنگ لباس اوڑھ کر جلوہ گر ہوتی رہی ہے اور اس سے مقابلہ کرنے والوں کے حالات بھی مختلف ہوتے ہیں، اس لیے اس کا راستہ روکنے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق جدو جہد کی جائے چنانچہ آج ہم جاہلیت کے جن مختلف فتنوں میں گرفتار ہیں اور انہوں نے ہماری زندگی کا جس طریق سے احاطہ کر رکھا ہے جب تک ہم انہیں پوری طرح سمجھ نہیں پاتے اس وقت تک جاہلیت کے ساتھ کوئی لڑائی بھی کامیابی کے ساتھ لڑی نہیں جا سکتی۔

اس ضمن میں پہلی چیز جس کا ذہن نشین کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آج کے اس دور میں جاہلیت ہم سے زندگی کے صرف ایک مورچے یا محاذ پر نبرد آزما نہیں بلکہ یہ لڑائی حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں میں ہے۔ پھر یہ تصادم اگر ایک طرف افکار و نظریات کی دنیا میں پایا جاتا ہے تو دوسری طرف عمل کا میدان بھی اس سے خالی نہیں۔ یہ فتنہ جس سے اس وقت ہمیں مقابلہ درپیش ہے اشراقی فلسفہ کی سی کوئی گمراہی نہیں۔ اس کا تعلق زندگی کی گہرائیوں سے ہے، اس کی جڑیں انسان کے قلب و دماغ میں پیوست ہیں اور اسکی شاخیں حیاتِ انسانی کی ساری وسعتوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لیے جب تک اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکا نہیں جاتا دینِ حق کو زندگی میں نافذ کرنے کی کوشش پوری طرح بار آور نہیں ہو سکتی۔ ایک تہذیب کو مٹانے کے لیے ایک تہذیب ہی اس کے مقابلے میں لانی پڑتی ہے اور ایک جاہلی تمدن کو تمدن کی ہی قوت سے مسمار کیا جاسکتا ہے۔

پھر ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ سائنس کی ایجادات و انکشافات نے صرف فکر و نظر کے زاویوں کو بدلا ہے بلکہ انسانی عمل کے دائروں کو بھی کافی حد تک متغیر کر دیا ہے۔ زمان و مکان کے سمٹ جانے سے حیاتِ انسانی کے مختلف شعبے باہم ایک دوسرے سے اسقدر قریب ہو گئے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کی جاسکتی۔ آپ اگر زندگی کے ایک شعبے میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو جب تک سارے شعبوں کو اُس کے مطابق تبدیل نہیں کر لیا جاتا یہ انقلابی کوشش کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اس کے ساتھ ساتھ ریاست کا دائرۂ عمل بھی اب اس قدر پھیل گیا ہے کہ زندگی کا کوئی گوشۂ قلب و دماغ کا کوئی ریشہ اس کے اثر و نفوذ سے آزاد نہیں رہا۔ اور یہ زبردست قوت جس کے ذرائع اور وسائل پہلی ریاستوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں، جاہلیت پھیلانے کے لیے پوری طرح محوِ عمل رہتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ جاہلیت اگرچہ پیدا تو اب بھی شیطانی دماغوں ہی میں ہوتی ہے مگر اب اس کی نشر و اشاعت کا سب سے مؤثر ذریعہ ریاست ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اس لیے ان بدلے ہوئے حالات میں جاہلیت کا مقابلہ کرنے کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں: یا تو ریاست کے دائرۂ اختیار کو کم کر دیا جائے، یا خدا کے آزاد بندوں کے لیے اس دنیا میں ایک ایسی سرزمین تلاش کی جائے جو کافرانہ نظامِ زندگی کے اثرات سے نہ صرف آزاد ہو بلکہ

مستقبل میں بھی اُس کی دستبرد سے بالکل محفوظ و مامون رہ سکے، یا پھر آخری صورت یہ ہے کہ جاہلی نظام کے اندر ہی رہتے ہوئے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے اور اس کو شکست دینے کے بعد ریاست کے رُخ کو صحیح راہ پر موڑ دیا جائے۔ جس دور میں سے ہم گزر رہے ہیں اس میں تیسری صورت کے سوا کوئی اور صورت ممکن نظر نہیں آتی۔ یہ راہ بلا شبہ سخت دشوار ہے مگر اس کے علاوہ اقامتِ دین کے لیے کوئی چارہ کار بھی باقی نہیں رہا ہے۔

اس منزل کی جو مشکلات ہیں اُن میں سے بعض تو وہ ہیں جو ظاہر و باہر ہیں یعنی جاہلیت کی حفاظت اور پاسبانی ریاست کا قہر و جبروت کرتا ہے اور اس کے نفاذ کے لیے اُس کے وسائل کام میں آتے ہیں لیکن اس کی بعض مشکلات ایسی بھی ہیں جو اکثر و بیشتر نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں اور بسا اوقات خدمتِ دین کے سچے جذبہ سے سرشار لوگ بھی بعض ایسی بے اعتدالیاں کر بیٹھتے ہیں جن سے دین کو فائدہ پہنچنے کی بجائے اسے شدید نقصان پہنچ جاتا ہے۔ ہم یہاں بعض ایسی دقتوں کی طرف ہی اشارہ کرتے ہیں۔

ہمارے اس دور میں جب کوئی شخص اقامتِ دین کا نیک اور مقدس ارادہ لیکر اُٹھتا ہے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ جاہلیت نے پوری زندگی پر تسلط قائم کر رکھا ہے۔ اُس نے صرف لوگوں کے افکار و نظریات اور اعمال و افعال کو متاثر نہیں کیا بلکہ سوچنے اور سمجھنے کے سارے انداز یکسر بدل دیئے ہیں پہلے تو ایسا شخص اس تسلط کی ہمہ گیری دیکھ کر گھبراتا ہے مگر جب ہمت کر کے راہ حق کی طرف قدم اُٹھاتا ہے تو یہ سوچ نہیں پاتا کہ آغاز کس طرح کرے۔ وہ غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کرتا ہے کہ چونکہ فساد کی اصل جڑ خالق و مخلوق کے مابین رشتہ کی خرابی میں ہے اس لیے سب سے پہلے اس رشتہ کو صحیح کرنا چاہیے۔ لیکن اُسے فوراً ہی اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ دورِ حاضر کی جاہلیت نے خالق اور مخلوق کے درمیان تعلق میں جو خرابی پیدا کی ہے وہ کسی مافوق الطبیعی احساس کا نتیجہ نہیں بلکہ محسوسات کی کرشمہ سازی ہے اس لیے وہ مجبوراً مابعد الطبیعیاتی مسائل کو چھوڑ کر امورِ دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور جاہلیت نے انسانیت پر جو مظالم ڈھائے ہیں اُن کی نشاندہی کرتا ہے اور لوگوں کے ذہن میں اس حقیقت کو اتارنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ برائیاں جنھیں وہ اس عالم مادی

ہیں دیکھ رہے ہیں یہ دراصل اپنے مالک اور خالق کو صحیح طور پر نہ پہچاننے کے لازمی نتائج ہیں۔ پھر اس کے مقابلے میں وہ مثبت طور پر ایک صحیح نظریۂ زندگی بھی پیش کرتا ہے تاکہ لوگ اُسے قبول کر کے جاہلیت کی پھیلائی ہوئی لعنتوں سے نجات حاصل کریں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک داعی الی الحق کو سب سے زیادہ مشکل پیش آتی ہے۔ ایک طرف وہ یہ دیکھتا ہے کہ جس نظامِ حیات کا وہ علمبردار ہے اُس میں اگرچہ اس دنیا کی بھلائی کا بھی سامان موجود ہے لیکن اس بھلائی کا حقیقی سرچشمہ چند ما فوق الطبیعی معتقدات ہیں اور خیر کی یہ کھیتی اُسی صورت میں ہری بھری ہوتی ہے جب اُسے ایمانیات کے ان روحانی چشموں سے سیراب کیا جائے۔ مگر دوسری طرف حق کی دعوت دینے والا اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا کہ اُس کا مخاطب جو محسوسات کا رسیا ہے اُس وقت تک کوئی چیز قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا جب تک کہ اُس کے سامنے امورِ دنیا کی اصلاح کا کوئی بہتر پروگرام نہ رکھا جائے۔ اس لیے وہ بیچارا اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ فریقِ مخالف کو محض سمجھانے کی خاطر اپنے نظامِ حیات کو جو بنیادی طور پر ایک روحانی نظام ہے دنیاوی نقطۂ نظر سے بھی افضل و اکمل ثابت کرے۔ اس معاملے میں بڑے ہی توازن اور احتیاط کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تجدیدِ دین کی یہی "پل صراط" ہے۔ اگر وہ اپنے مخالف کو اپنے نظریۂ حیات کی محسوس برکتوں سے آشنا کرنے کے بعد اسے اس غیر مرئی ذات تک پہنچا دیتا ہے جو اس سارے خیر کا منبع اور مبدا ہے تو وہ کامیاب ہے لیکن اگر وہ بدقسمتی سے خود اپنے آپ کو ہی اس مادی دنیا کے خم و پیچ میں ایسا اُلجھا لیتا ہے کہ فلاح و کامرانی کا اصل سرچشمہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے تو یہ سب سے بڑی ناکامی ہے۔

تجدید و احیائے دین کی مقدس کوششوں کی جو تاریخ ہمارے سامنے موجود ہے اُس پر ایک نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ بعض بڑے بڑے نیک اور بے نفس لوگ کس طرح ناکامی کا شکار ہوئے۔ انھوں نے وقت کے مسائل سے نپٹنے کے لیے اُسی عہد کے تقاضوں کے مطابق علمِ کلام تیار کیا اور اس سے کسی قدر مفید کام بھی لیا۔ لیکن شومئ قسمت کہ اپنی بات کو زیادہ مؤثر اور دلنشیں بنانے کے لیے حدِ اعتدال سے گذر گئے اور اپنی آواز کو نوائے وقت کے ساتھ آتنا ہم آہنگ کر دیا کہ وہ اُسی میں گم ہو کر رہ گئی اور اس کا کوئی الگ وجود بھی باقی نہ رہا۔ بلکہ

ہاں امام غزالیؒ نے بھی وقت کے تقاضوں کے مطابق باتیں کیں اور سر سید نے بھی یہی خدمت سرانجام دی لیکن دینی نقطۂ نظر سے ان دونوں کے اثرات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ امام صاحب کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور فلسفۂ یونان کا طلسم ٹوٹا اور اس کی جگہ لوگوں نے احکامِ الٰہی اور سنتِ رسولؐ کی طرف توجہ کی۔ یہ اُس خادمِ دین کا اتنا بڑا احسان ہے کہ ملتِ اسلامیہ کبھی بھی اس سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس سر سید مرحوم خواہ دنیاوی خدمات کے اعتبار سے کتنے اونچے ہی کیوں نہ ہوں لیکن دینی نقطۂ نظر سے انہوں نے متاعِ امت کا اتنا عظیم نقصان کیا کہ اسے آسانی کے ساتھ فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے اس بارے میں یہ بھی تسلیم ہے کہ سر سید کی نیت خراب نہ تھی۔ انہوں نے جو کچھ کیا اصلاح کے ارادے سے کیا۔ لیکن دیکھیے کہ تجدیدِ دین کے معاملہ میں معمولی بے احتیاطی نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور اُن کی اس بے ارادہ لغزش نے امتِ مسلمہ میں کن فتنوں کے دروازے کھول دیے۔ یہاں اس موضوع پر کسی تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔ لیکن اتنی بات ضرور ذہن نشین رہے کہ سر سید نے جس عہد میں آنکھ کھولی اُس میں سائنس کی ترقیوں نے انسانی نگاہ کو خیرہ کر رکھا تھا اور اس وجہ سے نیچر اور قواعدِ طبیعی صداقت کا معیار قرار پا چکے تھے۔ سر سید نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کا پرانا علمِ کلام اس نئے دور میں بکار آمد نہیں ہو سکتا تو انہوں نے اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے قرآن میں سے قوانینِ فطرت کی یکسانیت اور ہم آہنگی تلاش کی۔ یہ کام بڑا ہی اچھا اور مفید تھا اور دین کے لیے قوت اور حفاظت بن کر مغربی نظریات کی یلغار کو روک سکتا تھا لیکن اسے مسلمانوں کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ مرحوم کی آنکھیں قوانینِ فطرت میں ایسی اُلجھیں کہ ان کے خالق کی قوتوں کا انہیں احساس باقی نہ رہا۔ چنانچہ انہوں نے سارے دین کو اندھی بہری فطرت کے مطابق ڈھال دیا۔ معجزات کا جو خداوند تعالیٰ کی قوت کے زندہ مظاہر ہیں، سرے سے انکار کر دیا، یا ان کی اس طرح تاویل کی کہ ان میں اعجاز کی شان باقی نہ رہی جنت، دوزخ اور عقائدِ مابعد الطبیعی جو اسلام کی بنیادیں ہیں سب متزلزل ہو گئے اور اسلام اُن معنوں میں فطرت اللہ سمجھا جانے لگا جن معنوں میں نیچر کا لفظ بولا جاتا ہے۔

جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں بھی قریب قریب اسی قسم کے مسائل درپیش ہیں اور اُن کے حل کے لیے

ہمیں بھی انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ مغربی افکار و نظریات نے جن کی بنیاد سراسر مادی ہے ایک تہذیب ایک تمدن یا دوسرے لفظوں میں ایک نظامِ حیات کا روپ دھار لیا ہے۔ اس وجہ سے طرزِ سلطنت اور رفاہِ عام کے طور طریق ہی ایک دین کی صداقت کے معیار قرار پائے ہیں۔ یہ سارے معیارات اپنی نوعیت کے اعتبار سے عالمِ محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے دین کا جو داعی باطل کی جگہ حق قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ "امورِ دنیا" سے بحث کرے اور اپنے نظریہ کی وضاحت اُسی زبان اور اصطلاح میں کرے جو ان "دنیا پرستوں" کے لیے قابلِ فہم ہو اور پھر اُن کے نظامِ حیات کے اندر جو جو اسقام پائے جاتے ہیں اُن کی نشاندہی کر کے انہیں یہ بتائے کہ یہ ساری خامیاں کوئی وقتی اور اتفاقی چیزیں نہیں بلکہ اُس نظریہ کے لازمی اجزاء ہیں جو انھوں نے زندگی کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔ اس لیے جب تک وہ اپنے مالک اور خالق کے ساتھ اپنے تعلقات درست نہیں کرتے اس وقت تک اُن کے مصائب دور نہیں ہو سکتے۔ ظاہر بات ہے کہ اس قسم کی ذہنی فضا میں آدمی کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ عالمِ محسوسات کے مقدمات کو اس طریق سے ترتیب دے کہ ذہن خود بخود غیر محسوس ذات کی طرف منتقل ہو جائے۔ محسوس سے غیر محسوس کی طرف انتقالِ ذہن کا یہ عمل بڑا مشکل اور انتہائی احتیاط کا طالب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محسوسات کی بنیاد پر جو تمدن اس وقت قائم ہے اس سے زیادہ انسانی خواہشات کو تسکین دینے والا کوئی نظام نہیں، اس لیے عام انسانوں کے لیے یہ سب سے زیادہ کشش رکھتا ہے۔ جو نظریۂ حیات کسی چیز کی صداقت کے لیے صرف حواس کی شہادت کا طلبگار ہو اور جس میں اُن چیزوں کے لیے کوئی معمولی سے معمولی گنجائش بھی باقی نہ رہے جو حواس سے ماوراء ہوں وہاں اس طرح کے مقدمات قائم کرنا کہ انسانی ذہن ایک ایسے نظامِ حیات کی طرف متوجہ ہو جائے جس میں خدا، وحی، الہام، حشر و نشر جیسی غیر مرئی چیزیں بطورِ ایمانیات تسلیم کرنی پڑیں۔ خاصا دشوار اور دقت طلب کام ہے۔

پھر اس کام میں مشکلات کے علاوہ لاتعداد خطرات بھی ہیں اور ان میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ بعض اوقات دینِ حق کے علمبردار تعلیماتِ الٰہی کو قابلِ فہم بنانے کے لیے ان کی اس انداز سے تشریح و تعبیر

شروع کر دیتے ہیں کہ وہ رائج الوقت حسی نظام کی ہی ایک بہتر اور ترقی یافتہ صورت معلوم ہونے لگتی ہے اور اس طرح ایک عالمگیر نظامِ فکر و عمل جو محسوسات کی دنیا سے بحیثیت تو بلاشبہ کرتا ہے مگر جس کی بنیاد خالص روحانی ہے، جو زمانی اور مکانی قیود سے سراسر آزاد ہے، وہ وقتی تقاضوں کی جکڑ بندیوں میں گرفتار ہو کر محض ایک مادی نظام بن کے رہ جاتا ہے۔ دینِ حق کو وقتی مصلحتوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس کا حلیہ اس طرح سے بگاڑا جاتا ہے کہ جاہلیت اور اسلام کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اسلام کی اس مادہ پرستانہ تعبیر میں عمل کی بنیاد حسی تمدن کی طرح مصالح یا ذاتی اور قومی منافع قرار پاتی ہے۔ خوف خدا یا احتسابِ آخرت جو درحقیقت کسی الہامی دین میں عمل کے سب سے بڑے محرکات ہیں اُن کو یا تو محض اعتباری باتیں کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے یا پھر اُنہیں اس طرح توڑ موڑ کر پیش کیا جاتا ہے کہ انسانی زندگی میں اُن کی اثر آفرینی باقی نہیں رہتی۔ سر سید کی تحریکِ اصلاح سے لیکر فتنۂ انکارِ حدیث تک ہمارے ملک میں متجددین نے تاویلات اور تحریفات کے جو عجیب و غریب شاہکار پیش کیے ہیں وہ سب اُسی ذہنیت کے زندہ مظاہر ہیں۔ ان میں اسلام کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ سراسر ایک مادی تحریک کا پتہ دیتی ہے اور اُس کو دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسلام بھی ایک طرح کا حسی تمدن ہے۔ ان دونوں کے مابین اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہی کہ مادیئین خدا کے وجود کا کھل کر انکار کرتے ہیں لیکن یہ حضرات اُس کے وجود کے کسی حد تک قائل ہیں خواہ اس اقرار کا عملی زندگی سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ اس غلط طرزِ فکر نے دین کے معاملہ میں جو رخنہ اندازیاں کی ہیں اُن کا تذکرہ طولانی ہے۔ کہیں قوم کی معاشی خوشحالی کے لیے سود اور انشورنس کے جواز کی راہیں نکالی جا رہی ہیں، کہیں امتِ مسلمہ کے ذوقِ جمال کی تسکین کے لیے تصویر کشی اور پیکر تراشی اور رقص و سرود کے حق میں فتوے صادر ہو رہے ہیں اور کہیں بہتر معیارِ زندگی کے حصول کے لیے ضبطِ تولید کے حق میں دلائل فراہم کیے جا رہے ہیں۔ ان ساری کوششوں کے پس پردہ اگر جھانک کر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ صرف وقت کا جادو ہے جو سر چڑھ کر بول رہا ہے اور وہ دین جو سارے ادیان کی قوت اور طاقت کو ختم کر کے خود اپنی فرمانروائی قائم کرنے کے لیے دنیا میں نازل کیا گیا تھا اب بعض نااندیش لوگوں کی حماقت سے مغربی تحریکات کا ضمیمہ دار بن گیا

بے جا نہ ہوگا کہ اگر بات ختم کرنے سے پیشتر چند باتیں دین کے اُن مخلص خادموں سے بھی کر دی جائیں جو اسلام کو ہر قسم کی دستبرد سے بچانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس امر کا احساس ہے کہ دورِ حاضر میں اسلام کے گرد فتنوں کے ہجوم نے ان لوگوں کو بہت زیادہ محتاط اور حساس بنا دیا ہے۔ وہ جہاں ذراسی کوئی جنبش دیکھتے ہیں تو فوراً چونک جاتے ہیں۔ لیکن انہیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ احتیاط اپنی جگہ کتنی ہی صحیح اور درست سہی لیکن اس میں اور وہم پرستی میں بہت زیادہ فرق ہے اور یہ بیماری بھی اپنی جگہ کچھ کم خطرناک نہیں۔ اس سے بسا اوقات آدمی اپنے گھر کے آدمیوں کو ہی اپنا دشمن سمجھ بیٹھتا ہے اور شک و شبہ کی اس ہیجانی کیفیت میں انہیں اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتا ہے۔ اگر دین کے معاملہ میں ایک طرف لاپرواہی مہلک چیز ہے تو دوسری طرف وہمی پن سمِ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ نے ہم سب کو نورِ بصیرت دیا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم صحیح اور غلط کوششوں کے درمیان فرق کر سکیں۔ دو مختلف نقطہائے نظر کے خارجی مظاہر میں کہیں کوئی مشابہت دیکھ کر اُن پر ایک ہی حکم لگا دینا پرلے درجے کی بے احتیاطی ہے۔ زندگی میں جو مختلف نظامہائے حیات پائے جاتے ہیں ان کی حیثیت ریلوے جنکشن کی سی ہے جس میں سے کئی ایک لائنیں نکلتی ہیں۔ کچھ چند میل کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ دوڑتی ہیں۔ کچھ ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ لیکن ان کی منزلیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ یہی حال انسانی زندگی کا ہے۔ اس میں بے شمار تمدن ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو پروان چڑھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں کئی چیزیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص محض چند باتوں میں مشابہت دیکھ کر یہ فیصلہ صادر کر دے کہ یہ سارے ایک ہی ہیں تو اس کی بے بصیرتی میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ چند معاملات میں تمدنی مظاہر کا اتحاد اُن بنیادی افکار کے اتفاق کا ہم معنی نہیں ہوتا جن کے دراصل یہ عکس ہیں۔ اصل اور فیصلہ کن چیز وہ نظریات ہیں جو انہیں معرضِ وجود میں لاتے ہیں۔ آپ اگر ان مظاہر کی گہرائی میں اتر کر تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں ظاہری اتفاق و اتحاد کے باوجود ایک زبردست بُعد پایا جاتا ہے کیونکہ ایک نظامِ تمدن اپنے مختلف شعبوں کے درمیان رشتۂ تناسب قائم کرتا ہے

وہی حقیقت میں اس کی جان ہوتا ہے اور یہی چیز اُسے انفرادیت بخش کر دوسروں سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے لہذا چند باتوں میں اتفاق و اتحاد اساسی اتحاد کی علامت نہیں ہو سکتا۔

ہم نے اس امر کی وضاحت اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ اس کو نہ جاننے کی وجہ سے بعض بڑے نیک لوگ بھی عجیب و غریب غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یہاں اُن لوگوں سے کوئی سروکار نہیں جو ہر اُس آواز کے مخالف ہیں جو اُن کے حلقے سے باہر بلند ہوتی ہے یہاں ہمارے مخاطب وہ طبقہ ہے جو دین کے معاملے میں بڑا مخلص ہے۔ دین کے ساتھ اس کی محبت ہر اشتباہ سے بالا ہے مگر صورتِ حال کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے وہ اکثر اوقات ایسی باتیں کر جاتا ہے جو مفید اور کارآمد ہونے کی بجائے نقصان دہ ہوتی ہیں۔

خدا کے یہ پاکباز بندے جنہیں جدید تہذیب و تمدن کی ہوا تک بھی نہیں لگی ہوتی جب یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی فرد یا گروہ ایک الہامی مذہب کی صداقت پر "امورِ دنیا" کو بطور گواہ پیش کر رہا ہے تو وہ مضطرب ہو کر فوراً چلا اُٹھتے ہیں کہ دیکھیے اسلام کو ایک مادی تحریک بنایا جا رہا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے اس فیصلہ کا خود ہی غور سے تجزیہ کریں تو انشاء اللہ ان کی غلطی اُن پر خود بخود واضح ہو جائیگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید ذہن کو سمجھانے کے لیے ایسے مسائل سے ہی بحث کا آغاز کرنا پڑتا ہے جو محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ایمانداری سے یہ دیکھیے کہ کیا محسوسات کے انہیں مقدمات کو ترتیب دے کر ذہن کو فوق الطبیعی حقائق تسلیم کروانے پر آمادہ نہیں کیا جاتا؟

ان حضرات کے یہ خدشات اُن لوگوں کے حق میں صحیح ہیں جو یا تو فوق الطبیعی حقائق کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں یا اُن کی کوئی ایسی تاویل کرتے ہیں جو محسوسات کے مطابق ہو۔ لیکن جو لوگ خدا، وحی، الہام، جنت، دوزخ، فرشتے اور معجزات کو نہ صرف جوں کا توں مانتے ہیں بلکہ انہیں حیاتِ انسانی میں بطورِ اساس تسلیم کرتے ہیں اور ان کی کوئی مادی تعبیر نہیں کرتے انہیں یہ کہنا کہ یہ لوگ اسلام کو ایک

مادی تحریک بنا رہے ہیں ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

پھر بعض حلقوں کی طرف سے یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ یہ "شارحین اسلام اپنی ہمہ دانی کے زعم میں دین کو جدید نظریات و افکار کا ملغوبہ بنا رہے ہیں"۔ میں ان حضرات سے پوچھتا ہوں کہ کیا جدید نظریات و افکار کی تردید اُن کے نزدیک ملغوبہ بنانا ہے۔ کیا آپ اُن لوگوں پر یہ الزام لگانے میں حق بجانب ہیں جو سرمایہ پرستی کے اس دَور میں سود اور انشورنس کو حرام سمجھیں، جو قوم پرستی کے اس عہد میں بین الاقومیت کے علمبردار ہوں، جو فحاشی اور بد معاشی کے اس طوفان میں عفت اور حیا پر زور دیں اور بے پردگی کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب میں پردے کی حمایت پر کمربستہ ہوں اور جو ضبط تولید جیسے معاشی فلسفہ کو ذات باری تعالیٰ کے اس وعدہ پر منسوخ کر دیں:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (الانعام - ۱۹)

اور اپنی اولاد کو افلاس کے خوف سے قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔

پھر یہ بزرگ اپنے سارے علم و فضل کے باوجود اُن طریقوں کو بھی سمجھ نہیں پاتے جن کو کام میں لا کر اسلام کو ایک وقتی اور مادی تحریک بنایا جا سکتا ہے۔ اگر وہ ذرا سوچیں تو انہیں معلوم ہو گا کہ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ایک ضروری حربہ یہ ہے کہ دین میں سنتِ رسول کی حجیت کو ختم کر دیا جائے کیونکہ اسے ختم کرنے کے بعد ہی ایک انسان کو قرآن مجید میں من مانی تاویلات کرنے کی آزادی میسر آ سکتی ہے اور اس طرح تعلیماتِ الٰہی کو موڑ توڑ کر انہیں وقتی تقاضوں کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جو لوگ دین میں قرآن کے ساتھ سنتِ رسول کو بھی حجت تسلیم کرتے ہوں وہ اسے کوئی مادی یا وقتی تحریک نہیں بنا سکتے کیونکہ جب کوئی شخص اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی ہمارے مطاع اور متبوع ہیں اور انہوں نے جو کچھ فرمایا اور کیا اُس کی پیروی اور پابندی ہم پر لازم ہے اور کسی فرد، گروہ یا "مرکز ملت" کو اس میں تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں تو وہ لامحالہ اسلام کی

اُسی شکل کا قائل ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے متشکل فرمایا تھا۔ اس طرزِ فکر کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی اس سانچے ہی کو اپنے لیے آئیڈیل سمجھتا ہے جس میں حضورؐ کی ذاتِ اقدس نے فکر و عمل کے طریقوں کو ڈھالا تھا۔ اس ذہنی پس منظر کے ساتھ اسلام کو ایک مادی تحریک بنانا مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب محال ہے اور اس کی جسارت وہی شخص کر سکتا ہے جو یا تو انتہائی درجہ کا ڈھیٹ ہو یا پرلے درجے کا خائن۔ اور اس جرأت کی کسی ایسے فرد سے توقع نہیں کی جا سکتی جس کے دل میں خدا اور خلق کی کچھ بھی شرم موجود ہو۔

رسالہ ترجمان القرآن

کے خریداروں اور ایجنٹوں سے گذارش ہے کہ منی آرڈر بھیجتے وقت یا خط و کتابت کے سلسلے میں اپنے نمبر خریداری یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور تحریر کیا کریں۔ نئے خریدار اپنے مکمل پتے کے ساتھ جس ماہ سے وہ رسالہ جاری کروانا چاہیں اس کا حوالہ بھی منی آرڈر کوپن پر تحریر فرما دیا کریں۔

منیجر ترجمان القرآن لاہور

تفہیم القرآن

الشّعراء

(۶)

اِس (کتابِ مبین) کو شیاطین لیکر نہیں اترے ہیں[1]، نہ یہ کام ان کو سجتا ہے[2]، اور نہ وہ ایسا

[1] پہلے اس معاملے کا مثبت پہلو ارشاد ہوا تھا کہ یہ رب العالمین کی نازل کردہ ہے اور اسے روح الامین لیکر اترا ہے۔ اب اس کا منفی پہلو بیان کیا جا رہا ہے کہ اِسے شیاطین لیکر نہیں اترے ہیں جیسا کہ حق کے دشمنوں کا الزام ہے۔ کفارِ قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے جھوٹ کی جو مہم چلا رکھی تھی اس میں سب سے بڑی مشکل انہیں یہ پیش آ رہی تھی کہ اُس حیرت انگیز کلام کی کیا توجیہ کی جائے جو قرآن کی شکل میں لوگوں کے سامنے آ رہا تھا اور دلوں میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ یہ بات تو ان کے بس میں نہ تھی کہ لوگوں تک اس کے پہنچنے کو روک سکیں۔ اب پریشان کن مسئلہ ان کے لیے یہ تھا کہ لوگوں کو اس سے بدگمان کرنے اور اس کی تاثیر سے بچانے کے لیے کیا بات بنائیں۔ اس گھبراہٹ میں جو الزامات انہوں نے عوام میں پھیلائے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ کاہن ہیں اور عام کاہنوں کی طرح یہ کلام ان پر بھی شیاطین القا کرتے ہیں۔ اس الزام کو وہ اپنا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی کے پاس اس بات کو جانچنے کے لیے آخر کیا ذریعہ ہو سکتا ہے کہ یہ کلام کوئی فرشتہ لاتا ہے یا شیطان، اور شیطانی القاء کی تردید آخر کوئی کریگا تو کیسے

[2] یعنی یہ کلام اور یہ مضامین شیاطین کے منہ پر پھبتے بھی تو نہیں ہیں۔ کوئی عقل رکھتا ہو تو خود سمجھ سکتا ہے کہ کہیں یہ باتیں، جو قرآن میں بیان ہو رہی ہیں، شیاطین کی طرف سے بھی ہو سکتی ہیں؟ کیا تمہاری بستیوں میں کاہن موجود نہیں ہیں اور شیاطین سے ربط ضبط رکھ کر جو باتیں وہ کرتے ہیں وہ تم نے کبھی نہیں سنیں؟ کیا کبھی تم نے سنا ہے کہ کسی شیطان نے کسی کاہن کے ذریعہ سے لوگوں کو خدا پرستی اور خدا ترسی کی تعلیم دی ہو؟ شرک و

کرہی سکتے ہیں۳؎ وہ تو اس کی سماعت تک سے دُور رکھے گئے ہیں۴؎۔

بت پرستی سے روکا ہو؟ آخرت کی باز پرس کا خوف دلایا ہو؟ ظلم اور بدکاری اور بداخلاقیوں سے منع کیا ہو؟ نیکوکاری اور راستبازی اور خلقِ خدا کے ساتھ احسان کی تلقین کی ہو؟ شیاطین کا یہ مزاج کہاں ہے؟ ان کا مزاج تو یہ ہے کہ لوگوں میں فساد ڈلوائیں اور انہیں برائیوں کی طرف رغبت دلائیں۔ ان سے تعلق رکھنے والے کاہنوں کے پاس تو لوگ یہ پوچھنے جاتے ہیں کہ عاشق کو معشوق ملے گا یا نہیں۔ جوئے میں کونسا داؤں مفید رہے گا۔ دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے کیا چال چلی جائے۔ اور فلاں شخص کا اونٹ کس نے چرایا ہے۔ یہ مسائل اور معاملات چھوڑ کر کاہنوں اور ان کے سرپرست شیاطین کو خلقِ خدا کی اصلاح، بھلائیوں کی تعلیم اور برائیوں کے استیصال کی کب سے فکر لاحق ہوگئی؟

۳؎ یعنی شیاطین اگر کرنا چاہیں بھی تو یہ کام ان کے بس کا نہیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے آپ کو انسانوں کے سچے معلم اور حقیقی مزکی کے مقام پر رکھ کر خالص حق اور خالص خیر کی وہ تعلیم دے سکیں جو قرآن دے رہا ہے۔ وہ دھوکا دینے کی خاطر بھی اگر یہ روپ دھاریں تو ان کا کام ایسی آمیزشوں سے خالی نہیں ہو سکتا جو ان کی جہالت اور ان کے اندر چھپی ہوئی شیطانی فطرت کی غمازی نہ کردیں۔ نیت کی خرابی، ارادوں کی ناپاکی، مقاصد کی خباثت لازماً اس شخص کی زندگی میں بھی اور اس کی تعلیم میں بھی جھلک کر رہے گی جو شیاطین سے الہام حاصل کر کے پیشوا بن بیٹھا ہو۔ بے آمیز راستی اور خالص نیکی نہ شیاطین القاء کر سکتے ہیں اور نہ ان سے ربط ضبط رکھنے والے اس کے حامل ہو سکتے ہیں۔ پھر تعلیم کی بلندی و پاکیزگی پر مزید وہ فصاحت و بلاغت اور وہ علم حقائق ہے جو قرآن میں پایا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر قرآن میں بار بار یہ چیلنج دیا گیا ہے کہ انسان اور جن مل کر بھی چاہیں تو اس کتاب کے مانند کوئی چیز تصنیف کر کے نہیں لا سکتے قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل، رکوع ۱۰)۔ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (یونس-۴)

۴؎ یعنی اس قرآن کے القاء میں دخیل ہونا تو درکنار، جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح الامین اس کو لیکر چلتا ہے اور جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر وہ اس کو نازل کرتا ہے، اس پورے سلسلے میں کسی جگہ

پس اَے محمد، اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو، ورنہ تم بھی سزا پانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے ۔ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ، اور ایمان لانے والوں میں سے

بھی شیاطین کو کان لگا کر سننے تک کا موقع نہیں ملتا۔ وہ آس پاس کہیں پھٹکنے بھی نہیں پاتے کہ سن گن لے کر ہی کوئی بات اُچک لے جائیں اور جا کر اپنے دوستوں کو بتا سکیں کہ آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ پیغام سنانے والے ہیں، یا ان کی تقریر میں فلاں بات کا بھی ذکر آنے والا ہے۔

۵۵ یعنی چونکہ یہ خالص حق ہے فرمانروائے کائنات کی طرف سے، اور اس میں شیطانی آلائشوں کا ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہے، اس لیے یہاں حق کے معاملے میں کسی کے ساتھ رورعایت کا کوئی کام نہیں۔ خدا کو سب سے بڑھ کر اپنی مخلوق میں کوئی عزیز و محبوب ہو سکتا ہے تو وہ اس کا رسول پاک ہے۔ لیکن بالفرض اگر وہ بھی بندگی کی راہ سے بال برابر ہٹ جاتے اور خدائے واحد کے سوا کسی اور کو معبود کی حیثیت سے پکار بیٹھتے تو پکڑ سے نہیں بچ سکتا۔ تا بدیگراں چہ رسد۔ اس معاملہ میں جب خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں تو اور کون ہے جو خدا کی خدائی میں کسی اور کو شریک ٹھیرانے کے بعد یہ امید کر سکتا ہو کہ خود بچ نکلے گا یا کسی کے بچانے سے بچ جائیگا۔

۵۶ یعنی خدا کے اس بے لاگ دین میں جس طرح نبی کی ذات کے لیے کوئی رعایت نہیں اسی طرح نبی کے خاندان اور اس کے قریب ترین عزیزوں کے لیے بھی کسی رعایت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں جس کے ساتھ بھی کوئی معاملہ ہے اس کے اوصاف (Merits) کے لحاظ سے ہے۔ کسی کا نسب اور کسی کے ساتھ آدمی کا تعلق کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ گمراہی و بد عملی پر خدا کے عذاب کا خوف سب کے لیے یکساں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اور سب تو ان چیزوں پر پکڑے جائیں، مگر نبی کے رشتہ دار بچے رہ جائیں۔ اس لیے حکم ہوا کہ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو بھی صاف صاف متنبہ کر دو۔ اگر وہ اپنا عقیدہ اور عمل درست نہ رکھیں گے تو یہ بات ان کے کسی کام نہ آسکے گی کہ وہ نبی کے رشتہ دار ہیں۔

معتبر روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اپنے دادا کی اولاد کو خطاب فرمایا اور ایک ایک کو پکار کر صاف صاف کہدیا کہ یا بنی عبد المطلب، یا عباس، یا صفیہ عمۃ رسول اللہ۔ یا فاطمہ بنت محمد، انقذوا انفسکم من النار، فانی لا املک لکم من اللہ شیئاً،

جو لوگ تمہاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ، لیکن اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں تو

سلونی من مالی ما شئتم ''۔ اے بنی عبدالمطلب، اے عباس، اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی، اے فاطمہ محمد کی بیٹی، تم لوگ آگ کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرلو، میں خدا کی پکڑ سے تم کو نہیں بچا سکتا، البتہ میرے مال میں سے تم لوگ جو کچھ چاہو مانگ سکتے ہو''۔ پھر آپ نے صبح سویرے صفا کے سب سے اونچے مقام پر کھڑے ہو کر پکارا یا صباحاہ (ہائے صبح کا خطرہ)، اے قریش کے لوگو، اے بنی کعب بن لوئی، اے بنی مُرہ، اے آل قُصَی، اے بنی عبد مناف، اے بنی عبد شمس، اے بنی ہاشم، اے آل عبدالمطلب۔ اس طرح قریش کے ایک ایک قبیلے اور خاندان کا نام لے لے کر آپ نے آواز دی۔ عرب میں قاعدہ تھا کہ جب صبح تڑکے کسی اچانک حملے کا خطرہ ہوتا تو جس شخص کو بھی اس کا پتہ چل جاتا وہ اسی طرح پکارنا شروع کر دیتا اور لوگ اس کی آواز سنتے ہی ہر طرف سے دوڑ پڑتے۔ چنانچہ حضورؐ کی اس آواز پر سب لوگ گھروں سے نکل آئے، اور جو خود نہ آسکا اس نے اپنی طرف سے کسی کو خبر لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا: "لوگو، اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اس پہاڑ کے دوسری طرف ایک بھاری لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟" سب نے کہا ہاں، ہمارے تجربے میں تم کبھی جھوٹ بولنے والے نہیں رہے ہو۔ آپ نے فرمایا "اچھا تو میں خدا کا سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں۔ اپنی جانوں کو اس کی پکڑ سے بچانے کی فکر کرو۔ میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ قیامت میں میرے رشتہ دار صرف متقی ہونگے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ نیک اعمال لیکر آئیں اور تم لوگ دنیا کا وبال سر پر اٹھائے ہوئے آؤ۔ اس وقت تم پکارو گے یا محمد، مگر میں مجبور ہونگا کہ تمہاری طرف سے منہ پھیر لوں۔ البتہ دنیا میں میرا اور تمہارا خون کا رشتہ ہے اور یہاں میں تمہارے ساتھ ہر طرح کی صلۂ رحمی کرونگا۔" (اس مضمون کی متعدد روایات بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عائشہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت زُہیر بن عمرو اور حضرت قبیصہ بن مُخارق سے مروی ہیں)۔

یہ معاملہ صرف اس حد تک نہ تھا کہ قرآن میں اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ کا حکم آیا اور حضورؐ نے اپنے رشتہ داروں کو جمع کر کے بس اس کی تعمیل کر دی۔ دراصل اس میں جو اصول واضح کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ دین میں نبی

ان سے کہدو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں[ے]۔ اور اس زبردست اور رحیم پر

اور اس کے خاندان کے لیے کوئی امتیازی مراعات نہیں ہیں جن سے دوسرے محروم ہوں۔ جو چیز زہر قاتل ہے وہ سب ہی کے لیے قاتل ہے، نبی کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے اس سے خود بچے اور اپنے قریبی لوگوں کو اس سے ڈرائے، پھر ہر خاص و عام کو متنبہ کر دے کہ جو بھی اسے کھائے گا، ہلاک ہو جائیگا۔ اور جو چیز نافع ہے وہ سب ہی کے لیے نافع ہے، نبی کا منصب یہ ہے کہ سب سے پہلے اسے خود اختیار کرے اور اپنے عزیزوں کو اس کی تلقین کرے تاکہ ہر شخص دیکھ لے کہ یہ وعظ و نصیحت دوسروں ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ نبی اپنی دعوت میں مخلص ہے۔ اسی طریقے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر عامل رہے۔ فتح مکہ کے روز جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو آپ نے اعلان کیا کہ کل ربا فی الجاھلیۃ موضوع تحت قدمی ھاتین واول ما اضعہ ربا العباس "زمانہ جاہلیت کا ہر سود جو لوگوں کے ذمے تھا میرے ان قدموں تلے روند ڈالا گیا۔ اور سب سے پہلے جس سود کو میں ساقط کرتا ہوں وہ میرے چچا عباس کا ہے (واضح رہے کہ سود کی حرمت کا حکم آنے سے پہلے حضرت عباس سود پر روپیہ چلاتے تھے اور ان کا بہت سا سود اس وقت لوگوں کے ذمے وصول طلب تھا)۔ ایک مرتبہ چوری کے جرم میں قریش کی ایک عورت فاطمہ نامی کا ہاتھ کاٹنے کا آپ نے حکم دیا۔ حضرت اسامہ بن زید نے اس کے حق میں سفارش کی۔ اس پر آپ نے فرمایا خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

[ے] اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارے رشتہ داروں میں سے جو لوگ ایمان لا کر تمہاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ نرمی اور ملاطفت اور تواضع کا رویہ اختیار کرو، اور جو تمہاری بات نہ مانیں ان سے اعلان براءت کر دو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ارشاد صرف ان رشتہ داروں سے متعلق نہ ہو جنہیں متنبہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، بلکہ سب کے لیے عام ہو۔ یعنی جو بھی ایمان لا کر تمہارا اتباع کرے اس کے ساتھ تواضع برتو اور جو بھی تمہاری نافرمانی کرے اس کو خبردار کر دو کہ تیرے اعمال سے میں بری الذمہ ہوں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت قریش اور آس پاس کے اہلِ عرب میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے قائل ہو گئے تھے، مگر انہوں نے عملاً آپ کی پیروی اختیار

توکل کرو[۸] جو تمہیں اُس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے جب تم اٹھتے ہو[۹]، اور سجدہ گزار لوگوں میں تمہاری نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے[۱۰]۔ وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

نہ کی تھی، بلکہ وہ بدستور اپنی گمراہ سوسائٹی میں مل جل کر اُسی طرح کی زندگی بسر کر رہے تھے جیسی دوسرے کفار کی تھی اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے ماننے والوں کو ان اہل ایمان سے الگ قرار دیا جنہوں نے حضور کی صداقت تسلیم کرنے کے بعد آپ کا اتباع بھی اختیار کر لیا تھا۔ تواضع برتنے کا حکم صرف اسی موخرالذکر گروہ کے لیے تھا۔ باقی رہے وہ لوگ جو حضورؐ کی فرمانبرداری سے منہ موڑے ہوئے تھے، جن میں آپ کی صداقت کو ماننے والے بھی شامل تھے اور آپ کا انکار کر دینے والے بھی، ان کے متعلق حضور کو ہدایت کی گئی کہ ان سے بے تعلقی کا اظہار کر دو اور صاف صاف کہہ دو کہ اپنے اعمال کا نتیجہ تم خود بھگتو گے، تمہیں خبردار کر دینے کے بعد اب مجھ پر تمہارے کسی فعل کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

[۸] یعنی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی پروا کیے بغیر اس ذات کے بھروسے پر اپنا کام کیے جاؤ جو زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ اس کا زبردست ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ جس کی پشت پر اس کی تائید ہو اسے دنیا میں کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا۔ اور اس کا رحیم ہونا اس اطمینان کے لیے کافی ہے کہ جو شخص اس کی خاطر اعلائے کلمۃ الحق کے کام میں جان لڑائیگا اس کی کوششوں کو وہ کبھی رائیگاں نہ جانے دیگا۔

[۹] اٹھنے سے مراد راتوں کو نماز کے لیے اٹھنا بھی ہو سکتا ہے اور فریضۂ رسالت ادا کرنے کے لیے اُٹھنا بھی۔

[۱۰] اس سے کئی معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ جب نماز باجماعت میں اپنے مقتدیوں کے ساتھ اٹھتے اور بیٹھتے اور رکوع و سجود کرتے ہیں اُس وقت اللہ تعالیٰ آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ دوسرے، جب راتوں کو اٹھ کر آپ اپنے ساتھیوں کو (جن کے لیے "سجدہ گزار" کا لفظ امتیازی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے) دیکھتے پھرتے ہیں کہ وہ اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں، اس وقت آپ اللہ کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہوتے۔ تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اُس تمام دوڑ دھوپ اور تگ و دو سے واقف ہے جو آپ اپنے سجدہ گزار ساتھیوں کی معیت میں اس کے بندوں کی اصلاح کے لیے کر رہے ہیں۔ چوتھے یہ کہ

لوگو، کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اُترا کرتے ہیں؟ وہ ہر جعل ساز بدکار پر اُترا کرتے ہیں[۱۴۱] سنی سنائی باتیں کانوں میں پھونکتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں[۱۴۲]

سجدہ گزار لوگوں کے گروہ میں آپ کے تمام تصرفات اللہ کی نگاہ میں ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ آپ کس طرح ان کی تربیت کر رہے ہیں، کیسا کچھ ان کا تزکیہ آپ نے کیا ہے اور کس طرح مس خام کو کندن بنا کر رکھ دیا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کرام کی ان صفات کا ذکر یہاں جس غرض کے لیے کیا گیا ہے اس کا تعلق اوپر کے مضمون سے بھی ہے اور آگے کے مضمون سے بھی۔ اوپر کے مضمون سے اس کا تعلق یہ ہے کہ آپ حقیقت میں اللہ کی رحمت اور اس کی زبردست تائید کے مستحق ہیں، اس لیے کہ اللہ کوئی اندھا بہرا معبود نہیں ہے، دیکھنے اور سننے والا فرمانروا ہے، اس کی راہ میں آپ کی دوڑ دھوپ اور اپنے سجدہ گزار ساتھیوں میں آپ کی سرگرمیاں، سب کچھ اس کی نگاہ میں ہیں۔ بعد کے مضمون سے اس کا تعلق یہ ہے کہ جس شخص کی زندگی یہ کچھ ہو جیسی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، اور جس کے ساتھیوں کی صفات وہ کچھ ہوں جیسی کہ اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں، اس کے متعلق کوئی عقل کا اندھا ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس پر شیاطین اترتے ہیں یا وہ شاعر ہے۔ شیطان جن کاہنوں پر اترتے ہیں اور شعراء اور ان کے ساتھ لگے رہنے والوں کے جیسے کچھ رنگ ڈھنگ ہیں، وہ آخر کس سے پوشیدہ ہیں تمہارے اپنے معاشرے میں ایسے لوگ کثرت سے پائے ہی جاتے ہیں۔ کیا کوئی آنکھوں والا ایمانداری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی زندگی میں اور شاعروں اور کاہنوں کی زندگی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟ اب یہ کیسی ڈھٹائی ہے کہ ان خدا کے بندوں پر کھلم کھلا کہانت اور شاعری کی پھبتی کسی جاتی ہے اور کسی کو اس پر شرم بھی نہیں آتی۔

[۱۴۱] مراد ہیں کاہن، جوتشی، فال گیر، رمّال، اور "عامل" قسم کے لوگ جو غیب دانی کا ڈھونگ رچاتے پھرتے ہیں، گول مول لچھے دار باتیں بنا کر لوگوں کی قسمتیں بتاتے ہیں، یا سیانے بن کر جنوں اور روحوں اور موکلوں کے ذریعہ سے لوگوں کی بگڑی بنانے کا کاروبار کرتے ہیں۔

[۱۴۲] اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ شیاطین کچھ سن گن لیکر اپنے اولیاء پر القاء کرتے ہیں اور اس میں تھوڑی سی حقیقت کے ساتھ بہت سا جھوٹ ملا دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جھوٹے پاٹیے کاہن

رہے شعراء، تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں[۱۴۳]۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ

شیاطین سے کچھ باتیں سن لیتے ہیں اور پھر اپنی طرف سے بہت سا جھوٹ ملا کر لوگوں کے کانوں میں پھونکتے پھرتے ہیں۔ اس کی تشریح ایک حدیث میں بھی آئی ہے جو بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ بعض لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہنوں کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا وہ کچھ نہیں ہیں۔ انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ بعض اوقات تو وہ ٹھیک بات بتا دیتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا وہ ٹھیک بات جو ہوتی ہے اسے کبھی کبھار جن لے اڑتے ہیں اور جا کر اپنے دوست کے کان میں پھونک دیتے ہیں، پھر وہ اس کے ساتھ جھوٹ کی بہت سی آمیزش کر کے ایک داستان بنا لیتا ہے۔

۱۴۳؎ یعنی شاعروں کے ساتھ لگے رہنے والے لوگ اپنے اخلاق، عادات و خصائل اور افتادِ مزاج میں اُن لوگوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمہیں نظر آتے ہیں۔ دونوں گروہوں کا فرق ایسا کھلا ہوا فرق ہے کہ ایک نظر دیکھ کر ہی آدمی جان سکتا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور وہ کیسے۔ ایک طرف انتہائی سنجیدگی، تہذیب، شرافت، راستبازی اور خدا ترسی ہے۔ بات بات میں ذمہ داری کا احساس ہے، برتاؤ میں لوگوں کے حقوق کا پاس و لحاظ ہے، معاملات میں کمال درجہ کی دیانت و امانت ہے، اور زبان جب کھلتی ہے خیر ہی کے لیے کھلتی ہے، شر کا کلمہ کبھی اس سے ادا نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ یہ کہ ان لوگوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ایک بلند اور پاکیزہ نصب العین ہے جس کی دھن میں یہ رات دن لگے ہوئے ہیں اور ان کی ساری زندگی ایک مقصدِ عظیم کے لیے وقف ہے۔ دوسری طرف حال یہ ہے کہ کہیں عشق بازی اور شراب نوشی کے مضامین بیان ہو رہے ہیں اور حاضرین اچھل اچھل کر ان پر داد دے رہے ہیں، کہیں کسی زنِ بازاری یا کسی گھر کی بہو بیٹی کا حُسن موضوعِ سخن ہے اور سننے والے اس پر مزے لے رہے ہیں، کہیں جنسی مواصلت کی حکایت بیان ہو رہی ہے اور پورے مجمع پر شہوانیت کا بھوت مسلط ہے، کہیں ہزل بکا جا رہا ہے یا مسخرہ پن کی باتیں ہو رہی ہیں اور مجمع میں ہر طرف ٹھٹھے لگ رہے ہیں، کہیں کسی کی ہجو اڑائی جا رہی ہے اور لوگ اس سے لطف لے رہے ہیں، کہیں کسی کی بے جا تعریف ہو رہی ہے اور اس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں، اور کہیں کسی کے خلاف نفرت،

ہر وادی میں بھٹکتے ہیں[14] اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں[15]؟ —— بجز اُن لوگوں کے جو ایمان لائے

عداوت اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جا رہے ہیں اور سننے والوں کے دلوں میں ان سے آگ سی لگ جاتی ہے۔ ان مجلسوں میں شاعروں کے کلام سننے کے لیے جو ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگتے ہیں، اور بڑے بڑے شاعروں کے پیچھے جو لوگ لگے پھرتے ہیں ان کو دیکھ کر کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اخلاق کی بندشوں سے آزاد، جذبات و خواہشات کی رو میں بہنے والے، اور لطف و لذت کے پرستار، نیم حیوان قسم کے لوگ ہیں جن کے ذہن کو کبھی یہ خیال چھو بھی نہیں گیا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے زندگی کا کوئی بلند تر مقصد و نصب العین بھی ہو سکتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کا کھلا کھلا فرق و امتیاز اگر کسی کو نظر نہیں آتا تو وہ اندھا ہے، اور اگر سب کچھ دیکھ کر بھی کوئی محض حق کو نیچا دکھانے کے لیے ایمان نگل کر یہ کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے گرد جمع ہونے والے لوگ اُسی قبیل کے ہیں جیسے شعراء اور ان کے پیچھے لگے رہنے والے لوگ ہوتے ہیں، تو وہ جھوٹ بولنے میں بے حیائی کی ساری حدیں پار کر گیا ہے۔

[14] یعنی کوئی ایک متعین راہ نہیں ہے جس پر وہ سوچتے اور اپنی قوتِ گویائی صرف کرتے ہوں، بلکہ ان کا توسنِ فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے اور جذبات یا خواہشات و اغراض کی ہر نئی رو اُن کی زبان سے ایک نیا مضمون ادا کراتی ہے جسے سوچنے اور بیان کرنے میں اس بات کا کوئی لحاظ سرے سے ہوتا ہی نہیں کہ یہ بات حق اور صدق بھی ہے۔ کبھی ایک لہر اٹھی تو حکمت و موعظت کی باتیں ہونے لگیں اور کبھی دوسری لہر آئی تو اسی زبان سے انتہائی گندے سفلی جذبات کا ترشح شروع ہو گیا۔ کبھی کسی سے خوش ہوئے تو اُسے آسمان پر چڑھا دیا اور کبھی بگڑ بیٹھے تو اسی کو تحت الثریٰ میں جا گرایا۔ ایک بخیل کو حاتم اور ایک بزدل کو رستم و اسفندیار پر فضیلت دینے میں انہیں ذرا تامل نہیں ہوتا اگر اس سے کوئی غرض وابستہ ہو۔ اس کے برعکس کسی سے رنج پہنچ جائے تو اس کی پاک زندگی پر دھبہ لگانے اور اس کی عزت پر خاک پھینکنے میں، بلکہ اس کے نسب پر طعن کرنے میں بھی ان کو شرم محسوس نہیں ہوتی۔ خدا پرستی اور دہریت، مادہ پرستی اور روحانیت، حسنِ اخلاق اور بداخلاقی، پاکیزگی اور گندگی، سنجیدگی اور ہزل، قصیدہ اور ہجو سب کچھ ایک ہی شاعر کے کلام میں آپ کو پہلو بہ پہلو مل جائیں گے۔ شعراء کی ان معروف خصوصیات سے جو شخص واقف ہو اس کے دماغ

اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ

میں آخر یہ بے تکی بات کیسے آ ر سکتی ہے کہ اِس قرآن کے لانے والے پر شاعری کی تہمت رکھی جائے جس کی تقریر جچی تلی، جس کی بات دو ٹوک، جس کی راہ بالکل واضح اور متعین ہے اور جس نے حق اور راستی اور بھلائی کی دعوت سے ہٹ کر کبھی ایک کلمہ بھی زبان سے نہیں نکالا ہے۔

قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ آپ کے مزاج کو تو شاعری کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (یٰس۔ رکوع ۵)۔ "ہم نے اس کو شعر نہیں سکھایا ہے نہ یہ اس کے کرنے کا کام ہے" اور یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ جو لوگ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے وہ سب اسے جانتے تھے۔ معتبر روایات میں آیا ہے کہ کوئی شعر حضورؐ کو پورا یاد نہ تھا۔ دورانِ گفتگو میں کبھی کسی شاعر کا کوئی اچھا شعر زبانِ مبارک پر آتا بھی تو غیر موزوں پڑھ جاتے تھے، یا اس میں الفاظ کا الٹ پھیر ہو جاتا تھا۔ حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ دورانِ تقریر میں آپ نے شاعر کا مصرعہ یوں نقل کیا:

كفى بالاسلام والشيب للمرء ناهيا

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ اصل مصرع یوں ہے:

كفى الشيب والاسلام للمرء ناهيا

ایک مرتبہ عباس بن مرداس سُلَمی سے آپ نے پوچھا، کیا تم ہی نے یہ شعر کہا ہے:

اتجعل نهبي ونهب العبيد وبين الاقرع وعيينه

انہوں نے عرض کیا آخری فقرہ یوں نہیں ہے بلکہ یوں ہے بین عُیَینَۃَ والاقرع۔ آپ نے فرمایا معنی میں تو دونوں یکساں ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ حضورؐ کبھی اشعار بھی اپنی تقریروں میں استعمال فرماتے تھے؟ انھوں نے فرمایا شعر سے بڑھ کر آپ کو کسی چیز سے نفرت نہ تھی۔ البتہ کبھی کبھار بنی قیس کے شاعر کا ایک شعر پڑھتے تھے مگر اول کو آخر اور آخر کو اول پڑھ جاتے تھے حضرت ابوبکر عرض کرتے یا رسول اللہ یوں نہیں بلکہ یوں ہے، تو آپ فرماتے

لے لیا ؎ ـــــ اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے

کہ "بھائی میں شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر گوئی میرے کرنے کا کام ہے"۔ جس قسم کے مضامین سے عرب کی شاعری لبریز تھی وہ یا تو شہوانیت اور عشق بازی کے مضامین تھے، یا شراب نوشی کے، یا قبائلی منافرت اور جنگ و جدل کے، یا نسلی فخر و غرور کے۔ نیکی اور بھلائی کی باتیں ان میں بہت ہی کم پائی جاتی تھیں۔ پھر جھوٹ، مبالغہ، بہتان، ہجو، بے جا تعریف، ڈینگیں، طعن، پھبتیاں، اور مشرکانہ خرافات تو شاعری کی رگ رگ میں پیوست تھیں۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اس شاعری کے متعلق یہ تھی کہ لان یمتلیٔ جوف احدکم قیحا خیر لہ من ان یمتلیٔ شعراً۔ "تم میں سے کسی شخص کا جوف پیپ سے بھر جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرے"۔ تاہم جس شعر میں کوئی اچھی بات ہوتی تھی آپ اس کی داد بھی دیتے تھے اور آپ کا ارشاد تھا کہ ان من الشعر لحکمۃ "بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں"۔ امیہ بن ابی الصَّلت کا کلام سُن کر آپ نے فرمایا اٰمن شعرہ وکفر قلبہ "اس کا شعر مومن ہے مگر اس کا دل کافر ہے"۔ ایک مرتبہ ایک صحابی نے سو کے قریب عمدہ عمدہ اشعار آپ کو سنائے اور آپ فرماتے گئے ھیہ "اور سناؤ"۔

۵۱؎ یہ شاعروں کی ایک اور خصوصیت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کی عین ضد تھی۔ حضورؐ کے متعلق آپ کا ہر جاننے والا جانتا تھا کہ آپ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ آپ کے قول اور فعل کی مطابقت ایسی صریح حقیقت تھی جس سے آپ کے گرد و پیش کے معاشرے میں کوئی انکار نہ کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس شعراء کے متعلق کس کو معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں کہنے کی باتیں اور ہیں اور کرنے کی اور۔ سخاوت کا مضمون اس زور شور سے بیان کریں گے کہ آدمی سمجھے کہ شاید ان سے بڑھ کر دریا دل کوئی نہ ہوگا۔ مگر عمل میں کوئی دیکھے تو معلوم ہوگا کہ سخت بخیل ہیں۔ بہادری کی باتیں کریں گے مگر خود بزدل ہوں گے۔ بے نیازی اور قناعت و خودداری کے مضامین باندھیں گے مگر خود حرص و طمع میں ذلت کی آخری حد کو پار کر جائیں گے۔ دوسروں کی ادنیٰ کمزوریوں پر گرفت کریں گے مگر خود بدترین کمزوریوں میں مبتلا ہوں گے۔

۵۲؎ یہاں شعراء کی اس عام مذمت سے، جو اوپر بیان ہوئی، ان شعراء کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار خصوصیات کے حامل ہوں:

دوچار ہوتے ہیں[۱۷۱] ۔ع ۱۱ع

اوّل یہ کہ وہ مومن ہوں یعنی اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتابوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور آخرت پر یقین رکھتے ہوں
دوسرے یہ کہ اپنی عملی زندگی میں صالح ہوں، بدکار اور فاسق و فاجر نہ ہوں، اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہو کر جھک نہ مارتے پھریں
تیسرے یہ کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہوں، اپنے عام حالات اور اوقات میں بھی، اور اپنے کلام میں
بھی۔ یہ نہ ہو کہ شخصی زندگی تو زہد و تقویٰ سے آراستہ ہے مگر کلام سراسر رندی و ہوسناکی سے لبریز۔ اور یہ بھی نہ ہو کہ شعر
میں تو بڑی حکمت و معرفت کی باتیں بگھاری جا رہی ہیں مگر ذاتی زندگی کو دیکھیے تو یادِ خدا کے سارے آثار سے خالی۔ حقیقت
یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں یکساں مذموم ہیں۔ ایک پسندیدہ شاعر وہی ہے جس کی نجی زندگی بھی خدا کی یاد سے معمور ہو اور
شاعرانہ قابلیتیں بھی اس راہ میں وقف رہیں جو خدا سے غافل لوگوں کی نہیں بلکہ خداشناس، خدادوست اور خداپرست
لوگوں کی راہ ہے۔

چوتھی صفت ان مستثنیٰ قسم کے شاعروں کی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ شخصی اغراض کے لیے تو کسی کی ہجو نہ کریں، نہ
ذاتی یا نسلی و قومی عصبیتوں کی خاطر انتقام کی آگ بھڑکائیں، مگر جب ظالموں کے مقابلے میں حق کی حمایت کے لیے ضرورت
پیش آئے تو پھر زبان سے وہی کام لیں جو ایک مجاہد تیر و شمشیر سے لیتا ہے۔ ہر وقت گھگھیاتے ہی رہنا اور ظلم کے
مقابلے میں نیازمندانہ معروضات ہی پیش کرتے رہنا مومنوں کا شیوہ نہیں ہے۔ اسی کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ
کفار و مشرکین کے شاعر اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف الزامات کا جو طوفان اٹھاتے اور نفرت و عداوت کا جو
زہر پھیلاتے تھے اس کا جواب دینے کے لیے حضورؐ خود شعرائے اسلام کی ہمت افزائی فرمایا کرتے تھے چنانچہ کعب بن مالکؓ
سے آپ نے فرمایا اُہجہم فوالذی نفسی بیدہ لھو اشد علیہم من النبل۔ "ان کی ہجو کہو، کیونکہ اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری
جان ہے تمہارا شعر ان کے حق میں تیر سے زیادہ تیز ہے"۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا اُہجہم وجبریل معک
اور قل وروح القدس معک "ان کی خبر لو اور جبریل تمہارے ساتھ ہے"۔ "کہو اور روح القدس تمہارے ساتھ ہے"۔ آپ کا
ارشاد تھا کہ ان المومن یجاھد بسیفہ ولسانہ "مومن تلوار سے بھی لڑتا ہے اور زبان سے بھی"۔

[۱۷۱] ظلم کرنے والوں سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو حق کو نیچا دکھانے کے لیے سراسر ہٹ دھرمی کی راہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
پر شاعری اور کہانت اور ساحری اور جنون کی تہمتیں لگاتے پھرتے تھے تاکہ ناواقف لوگ آپ کی دعوت سے بدگمان ہوں اور آپ کی تعلیم کی طرف توجہ نہ دیں۔

جسٹس ایس اے رحمٰن صاحب کا دوسرا مکتوب گرامی

مکرمی صدیقی صاحب!

سلام مسنون۔ "ترجمان القرآن" کا شمارہ بابت ماہ اکتوبر موصول ہوا۔ اس میں میرا مرسلہ خط شائع کیا گیا ہے اور اس رعایت کے لیے ممنونِ احسان ہوں۔ جو تصریحات آپ نے خط کے بعد اپنی طرف سے شامل کی ہیں وہ پھر اسی ذہنیت کی غمازی کر رہی ہیں جو میرے لیے وجہ شکایت ہوئی۔ میری صاف گوئی معاف ہو تو عرض کروں کہ آپ کی تصریحات میں متعدد مقامات پر تضاد ہے اور اگر میں آپ کی تحریر کا تجزیہ کرنے بیٹھ جاؤں تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ خط لکھنے سے میرا مقصود اپنی پوزیشن صاف کرنا تھا نہ کہ کسی مذہبی بحث یا مناظرہ کا آغاز کرنا۔ اگر میری تقریر کے اس ملخص میں جو میں نے انجمن کی شائع کردہ روئداد سے لیا اور اس مزعومہ اقتباس میں جو مجھ سے آپ نے منسوب کیا، آپ کو باوجود تسلیم کردہ اختلافِ الفاظ کوئی فرق نظر نہیں آیا تو میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ؎

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ میرے مرسلہ اقتباس کو دوبارہ پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ اگر آپ بغیر اس معہود ذہنیت کے جو آپ کی غلط فہمی کا میرے نزدیک باعث ہوا ہے اسے پھر پڑھیں تو آپ پر انشاءاللہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ بہتر تو یہ ہوتا اور میں متوقع تھا کہ آپ ایسا کریں گے، کہ آپ فراخدلی سے میری تقریر کے فرضی اقتباس سے متعلق اپنی براءت اس طرح کرتے کہ آپ نے ناحق کسی راوی کی روایت پر اعتماد کر لیا۔ اور اس ناچیز پر فتوائے کفر صادر کرنے میں عجلت سے کام لیا۔ لیکن دیکھتا یہ ہوں کہ باوجود **اس اعتراف** کے کہ آپ سے "بعض مقامات پر کچھ زیادتی" ہوئی ہے آپ اس دعوی پر مُصر ہیں کہ میں نے وہی کچھ کہا ہے جو آپ کی دانست میں تجدد پسند

"متنفر مجمع" سے منسوب ہو سکتا ہے۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر آپ نے مجھے ایک طویل لیکچر پلانے کی زحمت اٹھائی ہے۔

میں تفصیلی جواب سے احتراز کرتا ہوں لیکن چند اشارات محض اس غرض سے کر رہا ہوں تاکہ میرا موقف آپ کی سمجھ میں آسکے۔

(۱) آپ نے میرے مرسلہ اقتباس کے ایک فقرہ پر اعتراض کیا ہے جس میں درج ہے کہ "قرآن کریم سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون کی جزئیات میں تبدیلی کرنے کی اجازت دی ہے"۔ غالباً یہاں انجمن کے روئداد نویس صاحب چند ایک الفاظ میری تقریر کے حذف کر گئے ہیں (تقریر ظاہر ہے کہ من وعن نقل نہیں ہو سکتی تھی)۔ میرا مقصود ہرگز یہ نہ تھا کہ یہ رائے کسی نص قرآنی پر مبنی ہے۔ ثبوت دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک صریحی متن سے اور ایک اس کے مضمر تضمنات سے (جسے انگریزی میں Necessary implication کہتے ہیں) یہاں ظاہر ہے کہ میری مراد دوسرے قسم کے طرز استدلال سے تھی۔ اور آپ بے سود لفظی نزاع کی بھول بھلیوں میں جا پڑے ہیں۔ غالباً اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ عرف اور ذخائر فقہ قرآن حکیم میں لفظاً درج نہیں ہیں۔ استنباطی مسائل جو بزرگوں نے قرآن کریم سے اخذ کیے بہر حال رائے اور قیاس کے اثرات سے تہی نہیں۔ اس لیے تقلید کے مقابلے میں اجتہاد کا دروازہ ہر زمانے میں کھلا رہنا چاہیے۔ آپ میری شرط "قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے" کو نظر انداز نہ کیجیے۔ معاذ اللہ میں نے خدائے قدوس سے ایسی کوئی بات منسوب کرنے کی جسارت نہیں کی جس کا شبہ آپ کو ہوا۔ "وقتی تقاضوں اور مصلحتوں" کے الفاظ جو آپ نے استعمال کیے وہ بھی متعدد معانی کے حامل ہیں اور اسی لیے گمراہ کن ہیں۔ میرا مقصود یہ ہرگز نہیں کہ قرآنی حدود سے باہر نکل کر محض دنیاوی مصلحتوں کے پیش نظر من مانے اصول و قوانین وضع کیے جائیں۔ نہ میں نے یہ کہا ہے کہ جو امور کلی یا جزئی طور پر قرآن میں طے کر دیئے گئے ہیں ان میں ہم رد و بدل کر لینے کے مجاز ہیں۔ رونا تو یہی ہے کہ آپ ایک بات فرض کر لیتے ہیں اور پھر بزعم خود اس کے خلاف قلمی جہاد شروع کر دیتے ہیں۔ تفسیر قرآن الگ موضوع ہے اور آپ تسلیم کریں گے کہ اس بارے میں پہلے بزرگ بھی اختلاف کر چکے ہیں۔

(۲) اکابر ائمہ کے سلسلہ میں میں نے کوئی مفروضہ قائم نہیں کیا بلکہ معاف کیجیے مفروضہ آپ قائم کر کے مجھ سے منسوب فرما رہے ہیں۔ میں نے بطورِ حقیقت یہ بات کہی تھی کہ ہمارے اکابر ائمہ نے مبرا عن الخطا ہونے کا دعویٰ یا عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اسی لیے ہو سکتا ہے کہ جو مصالح اُن کے پیشِ نظر ہوں بمرورِ زمانہ اُن میں تبدیلی واقع ہو چکی ہو اور لوگوں ہمیں ان کی آراء پر نظرِ ثانی کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس بارے میں میرا کوئی دل پسند نظریہ نہیں جسے میں حق بجانب ثابت کرنا چاہتا تھا۔ میں تو عصرِ حاضر کے مسلمانوں کے لیے بھی وہی حق طلب کر رہا ہوں جسے ابنِ تیمیہؒ سے لیکر علامہ اقبالؒ تک کئی روشن خیال بزرگوں نے جمودِ ملّی کے نقیض کے طور پر پیش کیا ہے۔ جیسا کہ آپ نے خود اعتراف کیا ہے کہ "ہمارے اس دور کا ہر لکھا پڑھا مسلمان اپنے پرانے علمی و فقہی ورثہ کا جائزہ لینے اور نئی ضرورتوں کے پیشِ نظر مناسب تبدیلیاں کرنے کا خواہشمند ہے اور یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کرتا"۔ میں نے اگر اسی بات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے تو کیوں گردن زدنی ہو گیا؟

(۳) رہا آپ کا یہ مسلک کہ تبدیلی اسی حد تک محدود رہے کہ کوئی شخص یا گروہ دلائل و براہین سے ثابت کر دے کہ ائمہ کرام کا فلاں فلاں استنباط قرآن و سنت کے مطابق نہیں ہے۔ جہاں تک قرآنِ حکیم کا تعلق ہے تفسیر و تعبیر کا حق برقرار رکھتے ہوئے ہر شخص اس سے اتفاق کرے گا۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں سنت کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ غالباً آپ انکار نہیں کریں گے کہ متعدد احادیثِ موضوعہ متداولہ مجموعوں میں شامل ہو گئی ہیں اور اس موضوع پر ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں اس معاملہ میں بھی افراط و تفریط کا قائل نہیں۔ سننِ متوارث جن کا تعلق طریقِ عبادات مثلاً نماز یا مناسکِ حج وغیرہ سے ہے ان کی حیثیت مسلّم و مامون ہے۔ لیکن باقی ماندہ موادِ احادیث روایت کے ساتھ درایت کے اصولوں پر پرکھا جانا چاہیے بیشتر اس کے کہ اس کی حجیت قبول کر لی جائے۔ میں تاریخی تنقید کا قائل ہوں۔

(۴) "قرآنِ مجید قانون کی کتاب نہیں"۔ حیرت ہے کہ میری تقریر میں وضاحتِ الفاظ کے علی الرغم آپ نے اس کے متعلق سوال اٹھایا ہے۔ میرا مقصد ظاہر ہے کہ اصطلاحی قانون (جس کی تعریف سے مروجہ قانون کی کتابوں کا شناسا بخوبی واقف ہے) اور اخلاقی قانون کے درمیان امتیاز کرنا تھا۔ قرآن ان معنوں

میں "قانون" کی کتاب نہیں جن معنوں میں "تعزیراتِ پاکستان" یا "ضابطۂ دیوانی" قانون کی کتابیں ہیں۔ قرآن کا مرتبہ ایسی کتابوں سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس میں ایک حصّہ قانون کا بھی ہے لیکن بحیثیت مجموعی یہ کتاب "قانونِ زندگی" ہے یعنی مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ معاف کیجیے آپ نے محض "مولویانہ" انداز سے اس فقرہ پر تعریض کی ہے۔

امید ہے ان گذارشات کے بعد آپ کے دل سے رفعِ اشتباہ ہو گیا ہو گا کہ میرا موقف کیا ہے۔ اگر آپ یہ خط بھی ترجمان القرآن میں شائع فرما دیں تو قارئینِ رسالہ کسی ممکنہ غلط فہمی سے محفوظ ہو جائیں گے۔

آخر میں معذرت خواہ ہوں کہ میں پہلے خط میں کسی قدر تلخ لہجۂ بیان اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ اہلِ علم کا احترام ہمیشہ مجھے ملحوظِ خاطر رہا ہے اور انشاء اللہ رہے گا۔ لیکن شغلِ تکفیر کو جو بدقسمتی سے ہماری تاریخ میں اکثر و بیشتر تشتت و افتراق کا موثر ذریعہ بنا رہا، بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھ سکتا۔ اس اختلاف کا واسطہ دیتے ہوئے جسے نبی کریمؐ نے امت کے لیے رحمت کہا تھا، آپ سے بھی درخواست کروں گا کہ اس بارے میں حزم و احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

نیاز کیش

عبدالرحمٰن

تبصرہ

از ابوالاعلیٰ مودودی

جناب ایس اے رحمٰن صاحب کا یہ عنایت نامہ ان کی خواہش کے احترام میں یہاں درج کر دیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ ایک مباحثہ کو بلا نہایت چلانا مناسب نہیں ہے اس لیے میں نے پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب سے گذارش کی ہے کہ وہ اس سلسلے کو ختم کر دیں اور مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے میری اس گذارش کو قبول کر لیا ہے۔ لیکن فاضل مکتوب نگار نے اپنے موقف کی وضاحت فرماتے ہوئے

نمبروار چند اشارات فرمائے ہیں ان میں سے نمبر ۳ کچھ بحث طلب ہے، کیونکہ اپنی موجودہ مختصر صورت میں وہ بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر سکتا ہے۔ اس لیے میں خود اس کے متعلق کچھ باتیں اس توقع کے ساتھ ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ وہ ان پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے۔

صدیقی صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ائمہ سلف کی مرتب کردہ فقہ پر نظر ثانی اگر کی جا سکتی ہے تو صرف اس بنیاد پر کہ ان کا کوئی اجتہاد و استنباط قرآن و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ فاضل مکتوب نگار اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے تفسیر و تعبیر کا حق برقرار رکھتے ہوئے ہر شخص اس سے اتفاق کرے گا لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں سنت کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔"

ان الفاظ سے یہ گمان ہوتا ہے کہ موصوف کے نزدیک قرآن تو اسلامی احکام معلوم کرنے کے لیے ضرور مرجع و سند ہے مگر وہ سنت کو یہ حیثیت دینے میں اس بنا پر متأمل ہیں کہ اس کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اب یہ بات ان کے بیان سے واضح نہیں ہوتی کہ اس مسئلے میں کیا چیز مختلف فیہ ہے؟

اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ بجائے خود سنت (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل اور امر و نہی) کا ماخذِ قانون اور مرجعِ احکام ہونا ہی مختلف فیہ ہے تو میں عرض کروں گا کہ یہ ایک خلافِ واقعہ بات ہے۔ جس روز سے امتِ مسلمہ وجود میں آئی ہے اس وقت سے آج تک یہ بات اہلِ اسلام میں کبھی مختلف فیہ نہیں رہی ہے۔ تمام امت نے ہمیشہ اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطاع اور متبوع ہیں، ان کے حکم کی اطاعت اور ان کے امر و نہی کا اتباع ہر مسلمان پر واجب ہے، جس طریقے پر چلنے کی انہوں نے اپنے قول و عمل اور تقریر سے تعلیم دی ہے اس کی پیروی پر ہم مامور ہیں، اور زندگی کے جس معاملے کا بھی انہوں نے فیصلہ کر دیا ہے اس میں کوئی دوسرا فیصلہ کر لینے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ تاریخ اسلام کے گذشتہ ۱۳۹۱ سال میں کس نے اور کب اس سے اختلاف کیا ہے۔ نرالی اپج نکالنے والے کچھ منفرد اور شاذ قسم کے خبطی تو دنیا میں ہمیشہ ہر گروہ میں پائے جاتے رہے ہیں۔ اس طرح کے افراد نے کبھی مسلماتِ قوم

کے خلاف کوئی بات کردی ہو تو اس کی بنا پر یہ کہہ دینا صحیح نہیں ہے کہ ایک عالمگیر مسلّمہ مختلف فیہ ہو گیا ہے اس لیے وہ مسلّمہ نہیں رہا۔ اس طرح تو خطیبوں کی تاخت سے قرآن بھی نہیں بچا ہے کہنے والے تحریفِ قرآن تک کا دعویٰ کر بیٹھے ہیں۔ اب کیا ان کی وجہ سے ہم کلام الٰہی کے مرجع و سند ہونے کو بھی مختلف فیہ مان لیں گے؟

لیکن اگر مختلف فیہ سنت کا بجائے خود مرجع و سند ہونا نہیں ہے بلکہ اختلاف جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے اور ہوا ہے وہ اس امر میں ہے کہ کسی خاص مسئلے میں جس چیز کے سنّت ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو وہ فی الواقع سنتِ ثابتہ ہے یا نہیں، تو ایسا ہی اختلاف قرآن کی آیات کے مفہوم و منشا میں بھی واقع ہوتا ہے۔ ہر صاحبِ علم یہ بحث اٹھا سکتا ہے کہ جو حکم کسی مسئلے میں قرآن سے نکالا جا رہا ہے وہ درحقیقت اس سے نکلتا ہے یا نہیں۔ فاضل مکتوب نگار نے خود قرآن مجید میں اختلافِ تفسیر و تعبیر کا ذکر کیا ہے اور اس اختلاف کی گنجائش ہونے کے باوجود وہ بجائے خود قرآن کو مرجع و سند مانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسی طرح الگ الگ مسائل کے متعلق سنتوں کے ثبوت و تحقیق میں اختلاف کی گنجائش ہونے کے باوجود فی نفسہٖ "سنت" کو مرجع و سند تسلیم کرنے میں انہیں کیوں تامل ہے۔

یہ بات ایک ایسے فاضل قانون داں سے جیسے کہ محترم مکتوب نگار ہیں، مخفی نہیں رہ سکتی کہ قرآن کے کسی حکم کی مختلف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص، ادارے یا عدالت نے تفسیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصل منشا قرار دیا ہو اس کے علم اور دائرۂ کار کی حد تک وہی حکمِ خدا ہے اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی وہی حکم خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سنت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر کے کسی مسئلہ میں جو سنت بھی ایک فقیہ، یا لیجسلیچر یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے وہی اس کے لیے حکمِ رسول ہے اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت میں رسولؐ کا حکم وہی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں یہ امر تو ضرور مختلف فیہ رہتا ہے کہ میرے نزدیک خدا یا رسول کا حکم کیا ہے اور آپ کے نزدیک کیا، لیکن جب تک میں اور آپ خدا اور اس کے رسول کو آخری سند (Final authority) مان رہے ہیں، ہمارے درمیان یہ امر مختلف فیہ نہیں ہو سکتا کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم بجائے خود ہمارے لیے قانونِ واجب الاتباع ہے۔ لہٰذا میں جناب ایس اے رحمان صاحب کی یہ بات سمجھنے سے معذور ہوں کہ

احکامِ فقہ کی تحقیق میں وہ قرآن کو تو اُن اختلافات کے باوجود مرجع و سند مانتے ہیں جو اس کے منشا کی تعیین میں واقع ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں مگر سنت کو یہ حیثیت دینے میں اس بنا پر تامل کرتے ہیں کہ جزئیاتِ مسائل کے متعلق سنتوں کے مشخص کرنے میں اختلافات واقع ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔

آگے چل کر صاحبِ موصوف سنت کو سند قرار نہ دینے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ "متعدد احادیثِ موضوعہ متداولہ مجموعوں میں شامل ہو گئی ہیں" اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اس موضوع پر ضخیم کتابیں بھی لکھی گئی ہیں"۔ بظاہر اس ارشاد سے ان کا مدعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنت ایک مشکوک چیز ہے۔ ممکن ہے کہ یہ شبہ اختصارِ بیان کی وجہ سے پیدا ہوتا ہو اور فی الواقع ان کا مدعا یہ نہ ہو۔ لیکن اگر ان کا مدعا یہی ہے تو میں عرض کروں گا کہ وہ اس مسئلے پر مزید غور فرمائیں۔ انشاء اللہ انہیں خود محسوس ہو گا کہ جس چیز کو وہ سنت کے مشکوک ہونے کی دلیل سمجھ رہے ہیں وہی در اصل اس کے محفوظ ہونے کا اطمینان دلاتی ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے اس سوال کو چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ کونسے متداول مجموعے ہیں جن میں احادیثِ موضوعہ شامل ہو گئی ہیں۔ اگرچہ مختلف محدثین نے جو مجموعے بھی مرتب کیے ہیں ان میں اپنی حد تک پوری چھان بین کر کے انہوں نے یہی کوشش کی ہے کہ قابلِ اعتماد روایات جمع کریں، مگر اس معاملے میں صحاحِ ستہ اور مؤطا کا پایہ جس قدر بلند ہے وہ اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تاہم تھوڑی دیر کے لیے ہم یہ مان بھی لیں کہ سب مجموعوں میں موضوعات نے کچھ نہ کچھ راہ پا لی ہے تو غور طلب بات یہ ہے کہ وہ "ضخیم کتابیں" جن کا ذکر فاضل مکتوب نگار کر رہے ہیں آخر ہیں کس موضوع پر۔ ان کا موضوع یہی تو ہے کہ کون کون سی حدیثیں وضعی ہیں، کون کون سے راوی کذاب اور وضاعِ حدیث ہیں، کہاں کہاں موضوع احادیث نے راہ پائی ہے، کس کتاب کی کون کون سی روایات ساقط الاعتبار ہیں، کن راویوں پر ہم اعتماد کر سکتے ہیں اور کن پر نہیں کر سکتے، "موضوع" کو "صحیح" سے جدا کرنے کے طریقے کیا ہیں، اور روایات کی صحت، ضعف، علت وغیرہ کی تحقیق کن کن طریقوں سے کی جا سکتی ہے۔ ان ضخیم کتابوں کی اطلاع پا کر تو ہمیں امن کا ویسا ہی اطمینان حاصل ہوتا ہے جیسا کسی کو یہ سن کر ہو کہ بکثرت چور پکڑ لیے گئے ہیں، بڑے بڑے جیل خانے ان سے بھر گئے ہیں، بہت سے اموالِ مسروقہ برآمد کیے گئے ہیں اور سراغرسانی کا ایک باقاعدہ انتظام موجود ہے جس سے آئندہ بھی چور پکڑے جا سکتے ہیں۔ لیکن تعجب کی بات ہو گی اگر کسی کے لیے یہی اطلاع

اُلٹی بے اطمینانی کی موجب ثابت ہو اور وہ اسے بدامنی کے ثبوت میں پیش کرنے لگے۔ بے شک بڑی مثالی حالتِ امن ہوتی اگر چوری کا سرے سے کبھی وقوع ہی نہ ہوتا۔ بلاشبہ اس طرح کی واردات ہو جانے سے کچھ نہ کچھ بے اطمینانی تو پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن مکمل حالتِ امن زندگی کے اور کس معاملے میں ہم کو نصیب ہے جو یہاں ہم اسے طلب کریں۔ جس حالت پر ہم دنیا میں بالعموم مطمئن رہتے ہیں اس کے لیے اتنا امن کافی ہے کہ چوروں کی اکثریت پکڑ کر بند کر دی جائے اور جو قلیل تعداد ابھی آزاد پھر رہی ہو اس کے پکڑے جانے کا معقول انتظام موجود ہو۔ کیا ہمارے سپریم کورٹ کے فاضل جج سنت کے معاملے میں اتنے امن پر قانع نہیں ہو سکتے؟ کیا وہ اُس مکمل امن سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہیں جس میں سرے سے چوری کے وقوع ہی کا نام و نشان نہ پایا جائے؟

آخر میں فاضل محترم تحریر فرماتے ہیں:

"میں اس معاملہ میں بھی افراط و تفریط کا قائل نہیں۔ سننِ متوارث جن کا تعلق طریقِ عبادات مثلاً نماز یا مناسکِ حج وغیرہ سے ہے ان کی حیثیت معمُون و مامون ہے لیکن باقی ماندہ موادِ احادیث روایت کے ساتھ درایت کے اصولوں پر پرکھا جانا چاہیے پیشتر اس کے کہ اس کی حجیت قبول کی جائے میں تاریخی تنقید کا قائل ہوں"۔

یہ ایک حد تک صحیح نقطۂ نظر ہے۔ لیکن اس میں چند امور ایسے ہیں جن پر میں آں محترم کو مزید غور و فکر کی دعوت دوں گا۔ جس تاریخی تنقید کے وہ قائل ہیں، فنِ حدیث اسی تنقید ہی کا تو دوسرا نام ہے۔ پہلی صدی سے آج تک اس فن میں یہی تنقید ہوتی رہی ہے اور کوئی فقیہ یا محدّث اس بات کا قائل نہیں رہا ہے کہ عبادات ہوں یا معاملات، کسی مسئلے کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت دی جانے والی کسی روایت کو تاریخی تنقید کے بغیر حجت کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ یہ فن حقیقت میں اس تنقید کا بہترین نمونہ ہے اور جدید زمانے کی بہتر سے بہتر تاریخی تنقید کو بھی مشکل ہی سے اس پر کوئی اضافہ و ترقی (Improvement) کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ محدثین کی تنقید کے اصول اپنے اندر ایسی نزاکتیں اور باریکیاں رکھتے ہیں جن تک موجودہ دور کے ناقدینِ تاریخ کا ذہن بھی ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر میں

بلا خوفِ تردید یہ کہوں گا کہ دنیا میں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت اور ان کے دور کی تاریخ کا ریکارڈ ہی ایسا ہے جو اُس کڑی تنقید کے معیاروں پر کسا جانا برداشت کر سکتا تھا جو محدثین نے اختیار کی ہے، ورنہ آج تک دنیا کے کسی انسان اور کسی دور کی تاریخ بھی ایسے ذرائع سے محفوظ نہیں رہی ہے کہ ان سخت معیاروں کے آگے ٹھیر سکے اور اس کو قابلِ تسلیم تاریخی ریکارڈ مانا جا سکے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارے جدید زمانے کے اہلِ علم اس فن کا تحقیقی مطالعہ نہیں کرتے اور قدیم طرز کے اہلِ علم جو اس میں بصیرت رکھتے ہیں وہ اس کو عصرِ حاضر کی زبان اور اسالیبِ بیان میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی وجہ سے باہر والے تو درکنار خود ہمارے اپنے گھر کے لوگ آج اس کی قدر نہیں پہچان رہے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علومِ حدیث میں سے اگر صرف ایک عِلَلِ حدیث ہی کے فن کی تفصیلات سامنے رکھ دی جائیں تو دنیا کو معلوم ہو کہ تاریخی تنقید کس چیز کا نام ہے۔ تاہم، میں یہ کہوں گا کہ مزید اصلاح و ترقی کا دروازہ بند نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ روایات کو جانچنے اور پرکھنے کے جو اصول محدثین نے اختیار کیے ہیں وہ حرفِ آخر ہیں۔ آج اگر کوئی اُن کے اصولوں سے اچھی طرح واقفیت پیدا کرنے کے بعد ان میں کسی کمی یا خامی کی نشان دہی کرے اور زیادہ اطمینان بخش تنقید کے لیے کچھ اصول معقول دلائل کے ساتھ سامنے لائے تو یقیناً اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ ہم میں سے آخر کون یہ نہ چاہے گا کہ کسی چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرار دینے سے پہلے اس کے سنتِ ثابتہ ہونے کا تیقّن حاصل کر لیا جائے اور کوئی کچی پکی بات حضور کی طرف منسوب نہ ہونے پائے۔

احادیث کے پرکھنے میں روایت کے ساتھ درایت کا استعمال بھی، جس کا ذکر محترم مکتوب نگار نے کیا ہے، ایک متفق علیہ چیز ہے۔ اگرچہ درایت کے مفہوم، اصول اور حدود میں فقہاء و محدثین کے مختلف گروہوں کے درمیان اختلافات رہے ہیں، لیکن بجائے خود اس کے استعمال پر تقریباً اتفاق ہے اور دورِ صحابہ سے لیکر آج تک اسے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں جو بات پیش نظر رہنی چاہیے، اور مجھے امید ہے کہ فاضل مکتوب نگار کو بھی اس سے اختلاف نہ ہوگا، وہ یہ ہے کہ درایت صرف انہی لوگوں کی معتبر ہو سکتی ہے جو قرآن و حدیث اور فقہِ اسلامی کے مطالعہ و تحقیق میں اپنی عمر کا کافی حصہ صرف کر چکے ہوں، جن میں ایک مدت کی ممارست نے ایک تجربہ کار جوہری کی سی بصیرت پیدا کر دی ہو،

اور خاص طور پر یہ کہ جن کی عقل اسلامی نظامِ فکر و عمل کے حدود اربعہ سے باہر کے نظریات، اصول اور اقدار کے اسلامی روایات کو اُن کے معیار سے پرکھنے کا ڈھلان نہ رکھتی ہو۔ بلا شبہ عقل کے استعمال پر ہم کوئی پابندی نہیں لگا سکتے، نہ کسی کہنے والے کی زبان پکڑ سکتے ہیں۔ لیکن بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ اسلامی علوم سے کورے لوگ اگر اناڑی پن کے ساتھ کسی حدیث کو خوش آیند پا کر قبول اور کسی کو اپنی مرضی کے خلاف پا کر ردّ کرنے لگیں، یا اسلام سے مختلف کسی دوسرے نظامِ فکر و عمل میں پرورش پائے ہوئے حضرات یکایک اٹھ کر اجنبی معیاروں کے لحاظ سے احادیث کے ردّ و قبول کا کاروبار پھیلا دیں، تو مسلم ملت میں نہ ان کی درایت مقبول ہو سکتی ہے اور نہ اِس ملت کا اجتماعی ضمیر ایسے بے تکے عقلی فیصلوں پر کبھی مطمئن ہو سکتا ہے۔ اسلامی حدود میں تو اسلام ہی کی تربیت پائی ہوئی عقل اور اسلام کے مزاج سے ہم آہنگی رکھنے والی عقل ہی ٹھیک کام کر سکتی ہے۔ اجنبی رنگ و مزاج کی عقل یا غیر تربیت یافتہ عقل بجز اس کے کہ انتشار پھیلائے کوئی تعمیری خدمت اِس دائرے میں انجام نہیں دے سکتی۔

سنّت کی جو تقسیم محترم مکتوب نگار نے "سنن متوارثہ جن کا تعلق طریقِ عبادات سے ہے" اور "باقی ماندہ موادِ احادیث" میں کی ہے، اور ان میں سے متقدم الذکر کو محفوظ و مامون اور مؤخر الذکر کو محتاجِ تنقید قرار دیا ہے، اس سے اتفاق کرنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ بظاہر اس تقسیم میں جو تصور کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ جو طریقے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادات کے متعلق سکھائے تھے وہ تو امت میں عملاً جاری ہو گئے اور نسل کے بعد نسل ان کی پیروی کرتی رہی، اس لیے یہ "متوارثہ" سنتیں محفوظ رہ گئیں، باقی رہے دوسرے معاملاتِ زندگی تو ان میں حضورؐ کی ہدایات نہ عملاً جاری ہوئیں، نہ ان پر کوئی نظامِ تمدن و معاشرت کام کرتا رہا، نہ وہ بازاروں اور منڈیوں میں رائج ہوئیں، نہ عدالتوں میں ان پر فیصلے ہوئے، اس لیے وہ بس متفرق لوگوں کی سینہ بسینہ روایات تک محدود رہ گئیں، اور یہی مواد ایسا ہے کہ اب اس میں سے بڑی دیدہ ریزی کے بعد قابلِ اعتبار چیزیں تلاش کرنی ہوں گی۔ فاضل مکتوب نگار کا تصور اگر اس کے سوا کچھ اور ہے تو میں بہت شکر گزار ہوں گا کہ وہ میری غلط فہمی رفع کر دیں۔ لیکن اگر یہی ان کا تصور ہے تو میں عرض کروں گا کہ یہ تاریخِ سنت کی واقعی صورتِ حال سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد نبوت میں مسلمانوں کے لیے محض ایک پیر و مرشد اور واعظ نہیں تھے بلکہ عملاً ان کی جماعت کے قائد، رہنما، حاکم، قاضی، شارع، مربی، معلم سب کچھ تھے اور عقائد و تصورات سے لیکر عملی زندگی کے تمام گوشوں تک مسلم سوسائٹی کی پوری تشکیل آپ ہی کے بتائے سکھائے اور مقرر کیے ہوئے طریقوں پر ہوئی تھی۔ اس لیے یہ کبھی نہیں ہوا کہ آپ نے نماز روزے اور مناسکِ حج کی جو تعلیم دی ہو بس وہی مسلمانوں میں رواج پاگئی ہو، اور باقی باتیں محض وعظ و ارشاد میں مسلمان سن کر رہ جاتے ہوں۔ بلکہ فی الواقع جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ جس طرح آپ کی سکھائی ہوئی نماز فوراً مسجدوں میں رائج ہوئی اور اسی وقت جماعتیں اس پر قائم ہونے لگیں ٹھیک اسی طرح شادی بیاہ اور طلاق و وراثت کے متعلق جو قوانین آپ نے مقرر کیے انہی پر مسلم خاندانوں میں عمل شروع ہو گیا، لین دین کے جو ضابطے آپ نے مقرر کیے انہی کا بازاروں میں چلن ہونے لگا، مقدمات کے جو فیصلے آپ نے کیے وہی ملک کا قانون قرار پائے، لڑائیوں میں جو معاملات آپ نے دشمنوں کے ساتھ اور فتح پاکر مفتوح علاقوں کی آبادی کے ساتھ کیے وہی مسلم مملکت کے ضابطے بن گئے، اور فی الجملہ اسلامی معاشرہ اور اس کا نظامِ حیات اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ انہی سنتوں پر قائم ہوا جو آپ نے یا تو خود رائج کیں یا جنہیں پہلے کے مروج طریقوں میں سے بعض کو برقرار رکھ کر آپ نے سنتِ اسلام کا جزء بنالیا۔ یہ وہ معلوم و متعارف سنتیں تھیں جن پر مسجد سے لیکر خاندان، منڈی، عدالت، ایوانِ حکومت اور بین الاقوامی سیاست تک مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام ادارات نے حضورؐ کی زندگی ہی میں عملدرآمد شروع کر دیا تھا اور بعد میں خلفائے راشدین کے عہد سے لیکر دورِ حاضر تک ہمارے اجتماعی ادارات کا ڈھانچہ انہی پر قائم ہے۔ پچھلی صدی تک تو ان ادارات کے تسلسل میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی انقطاع رونما ہوا ہے تو صرف حکومت و عدالت اور پبلک لا کے ادارات عملاً درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر آپ "متوارث" سنتوں کی محفوظیت کے قائل ہیں تو عبادات اور معاملات دونوں سے تعلق رکھنے والی یہ سب معلوم و متعارف سنتیں متوارث ہی ہیں۔ ان کے معاملے میں ایک طرف حدیث کی مستند روایات اور دوسری طرف امت کا متواتر عمل، دونوں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ان میں

مسلمانوں کی بے راہ روی سے جو الحاقی چیز بھی کبھی داخل ہوئی ہے، علمائے امت نے اپنے اپنے دور میں بروقت "بدعت" کی حیثیت سے اس کی الگ نشاندہی کر دی ہے اور قریب قریب ہر ایسی بدعت کی تاریخ موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کس زمانے سے اس کا رواج شروع ہوا۔ مسلمانوں کے لیے ان بدعات کو سننِ متعارفہ سے ممیز کرنا کبھی مشکل نہیں رہا ہے۔

اِن معلوم و متعارف سنتوں کے علاوہ ایک قسم سنتوں کی وہ تھی جنہیں حضورؐ کی زندگی میں شہرت اور رواجِ عام حاصل نہ ہوا تھا، جو مختلف اوقات میں حضورؐ کے کسی فیصلے، ارشاد، امر و نہی، تقریر و اجازت، یا عمل کو دیکھ کر یا سن کر خاص خاص اشخاص کے علم میں آئی تھیں اور عام لوگ ان سے واقف نہ ہو سکے تھے۔ یہ سنتیں عبادات اور معاملات، دونوں ہی طرح کے امور سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ ان کا تعلق صرف معاملات سے تھا۔ ان سنتوں کا علم جو متفرق افراد کے پاس بکھرا ہوا تھا، امت نے اس کو جمع کرنے کا سلسلہ حضورؐ کی وفات کے بعد فوراً ہی شروع کر دیا، کیونکہ خلفاء، حکام، قاضی، مفتی اور عوام سب اپنے اپنے دائرۂ کار میں پیش آمدہ مسائل کے متعلق کوئی فیصلہ یا عمل اپنی رائے اور استنباط کی بنا پر کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ہدایت تو موجود نہیں ہے۔ اسی ضرورت کی خاطر ہر اُس شخص کی تلاش شروع ہوئی جس کے پاس سنت کا کوئی علم تھا، اور ہر اُس شخص نے جس کے پاس ایسا کوئی علم تھا خود بھی اس کو دوسروں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھا۔ یہی روایتِ حدیث کا نقطۂ آغاز ہے، اور ۱۱ھ سے تیسری چوتھی صدی تک ان متفرق سنتوں کو فراہم کرنے کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ موضوعات گھڑنے والوں نے ان کے اندر آمیزش کرنے کی جتنی بھی کوششیں کیں وہ قریب قریب سب ناکام ہو گئیں، کیونکہ جن سنتوں سے کوئی حق ثابت یا ساقط ہوتا تھا، جن کی بنا پر کوئی چیز حرام یا حلال ہوتی تھی، جن سے کوئی شخص سزا پا سکتا تھا یا کوئی ملزم بری ہو سکتا تھا، غرض یہ کہ جن سنتوں پر احکام اور قوانین کا مدار تھا ان کے بارے میں حکومتیں اور عدالتیں اور افتاء کی مسندیں اتنی بے پروا نہیں ہو سکتی تھیں کہ یوں ہی اٹھ کر کوئی شخص قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیتا اور ایک حاکم یا جج یا مفتی اسے

مان کر کوئی حکم صادر کرڈالتا تھا اسی لیے جو سنتیں احکام سے متعلق تھیں ان کے بارے میں پوری چھان بین کی گئی، سخت تنقید کی چھلنیوں سے ان کو چھانا گیا، روایت کے اصولوں پر بھی انہیں پرکھا گیا اور درایت کے اصولوں پر بھی، اور وہ سارا مواد جمع کر دیا گیا جس کی بنا پر کوئی روایت مانی گئی ہے یا رد کر دی گئی ہے تاکہ بعد میں بھی ہر شخص اس کے ردّ و قبول کے متعلق تحقیقی رائے قائم کر سکے۔ ان سنتوں کا ایک معتدبہ حصّہ فقہاء اور محدثین کے درمیان متفق علیہ ہے، اور ایک حصے میں اختلافات ہیں۔ بعض لوگوں نے ایک چیز کو سنّت مانا ہے اور بعض نے نہیں مانا۔ مگر اس طرح کے تمام اختلافات میں صدیوں اہلِ علم کے درمیان بحثیں جاری رہی ہیں اور نہایت تفصیل کے ساتھ ہر نقطۂ نظر کا استدلال اور وہ بنیادی مواد جس پر یہ استدلال مبنی ہے فقہ اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ آج کسی صاحبِ علم کے لیے بھی یہ مشکل نہیں ہے کہ کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کے متعلق تحقیق سے خود کوئی رائے قائم کر سکے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ سنّت کے نام سے متوحش ہونے کی کسی کے لیے بھی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ البتہ اُن لوگوں کا معاملہ مختلف ہے جو اس شعبۂ علم سے واقف نہیں ہیں اور جنہیں بس دور ہی سے حدیثوں میں اختلافات کا ذکر سن کر گھبراہٹ لاحق ہو گئی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ احادیث میں جو مواد احکام سے متعلق نہیں ہے بلکہ جس کی نوعیت محض تاریخی ہے، یا جو فِتَن، ملاحم، رِقاق، مناقب، فضائل، اور اسی طرح کے دوسرے امور سے تعلق رکھتا ہے، اس کی چھان بین میں وہ عرق ریزی نہیں کی گئی ہے جو احکامی سنتوں کے باب میں ہوئی ہے۔ اس لیے موضوعات نے اگر راہ پائی بھی ہے تو زیادہ تر انہی ابواب کی روایات میں پائی ہے۔ احکامی سنتیں بے اصل اور جھوٹی روایتوں سے تقریبًا بالکل ہی پاک کر دی گئی ہیں۔ ان سے تعلق رکھنے والی روایتوں میں ضعیف خبریں تو ضرور موجود ہیں مگر موضوعات کی نشاندہی مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔ اور اخبارِ ضعیفہ میں سے بھی جس کسی کو فقہ کے کسی اسکول نے قبول کیا ہے اس بنا پر کیا ہے کہ اس کے نزدیک وہ قرآن سے، سنن متعارفہ کے جانے پہچانے نظام سے اور شریعت کے جامع اصولوں سے مناسبت رکھتی ہے، یعنی روایۃً ضعیف ہونے کے باوجود درایۃً اس

میں معنی کی قوت موجود ہے۔

محترم مکتوب نگار کی چند سطروں پر یہ تفصیلی تبصرہ میں نے صرف اس لیے کیا ہے کہ یہ سطریں کسی عام آدمی کے قلم سے نہیں نکلی ہیں بلکہ ایک ایسے بزرگ کے قلم سے نکلی ہیں جنہیں ہمارے سپریم کورٹ کے جج کی بلند پوزیشن حاصل ہے۔ سنّت کی شرعی و قانونی حیثیت کے متعلق اس پوزیشن کے بزرگوں کی رائے میں ذرہ برابر بھی کوئی کمزور پہلو ہو تو وہ بڑے دُور رس نتائج پیدا کر سکتا ہے قریب کے زمانے میں سنت کے متعلق عدلیہ کی بعض دوسری بلند پایہ شخصیتوں کے ایسے ریمارک بھی سامنے آئے ہیں جو صحیح علمی نقطۂ نظر سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جو باتیں میں نے اس تبصرے میں عرض کی ہیں انہیں فاضل مکتوب نگار ہی نہیں، ہمارے دوسرے حکامِ عدالت بھی اُسی بے لاگ نگاہ سے ملاحظہ فرمائیں جس کی ہم اپنی عدلیہ سے توقع رکھتے ہیں۔

سلسلۂ دروسِ فقہ
از ڈاکٹر معروف دوالیبی، شام

کتاب و سُنّت

(۱)

کتاب اللہ

کتاب اللہ یا بالفاظِ دیگر قرآنِ کریم اسلامی شریعت کا ماخذِ اساسی اور اصلِ اوّل ہے۔ یہ اس سے بالاو برتر ہے کہ انسان اسے حیطۂ تعریف میں لائے یا اپنے بیان کی حدود میں محدود کرے۔ صاحبِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب اللہ کا نزول نجماً نجماً (یعنی اجزاء اور ٹکڑوں کی صورت میں) ہوا ہے۔ نزول کی ابتداء آپؐ کی ولادت مبارک کے اکتالیسویں سال ۱۷ رمضان المبارک کی رات سے ہوئی اور انتہاء پیدائش کے ۶۳ ویں سال اور ہجرت کے دسویں سال ذوالحجہ کی ۹ تاریخ کو یعنی حج کے روز ہوئی۔ نزول کی صورت یہ تھی کہ حالات جس امر کے متقاضی ہوتے تھے یا معاشرہ کے جو داعیات و مطالبات ہوتے اُن کے مطابق کبھی ایک آیت اترتی اور کبھی یکبارگی چند آیات نازل ہو جاتیں۔ تمام قرآن مختلف سورتوں میں منقسم ہے۔ ان سورتوں کی کل تعداد ۱۱۴ ہے۔ پہلی سورت الفاتحہ ہے اور آخری الناس ہے۔ پھر ہر سورت چند آیات سے مرکب ہے، ان آیات کی مجموعی تعداد ۶ ہزار ۲ سو ۳۶ ہے۔ اس عظیم تعداد میں سے وہ آیات جن میں شرعی اور قانونی احکام بیان کیے گئے ہیں۔ صرف ۵ سو کی تعداد میں ہیں۔ سب سے پہلے جن آیات کا نزول ہوا ہے۔ وہ سورۂ علق (پارہ ۳۰) کی مذکورۂ ذیل ابتدائی آیات ہیں:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔

اپنے ربّ کے نام سے پڑھ، جس نے کائنات کو پیدا کیا (خاص طور پر) انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھ، تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے علم سکھایا اور انسان کو ان چیزوں کا علم دیا جن وہ بے خبر تھا۔

سب سے آخر میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد حجۃ الوداع کے روز نازل ہوا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ، وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ، وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ۔ پ ۶)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا۔

قرآن کی دعوت اور اس کے اصول | قرآن جس دعوت کو لے کر اٹھا ہے، اس کے دو بنیادی مقاصد ہیں، اولاً تمام غیر عقلی اور جاہلی رسوم و عادات کی بیخ کنی۔ ثانیاً معاشرۂ انسانی کی کامل اور جامع اصلاح، جو مذہبی عقائد و نظریات سے لے کر اجتماعی تعلقات تک محیط ہے۔ ان دونوں برتر مقاصد کی تکمیل و اتمام کے لیے قرآن نے اپنی مساعیٔ دعوت کو چار شعبوں پر مرتکز کیا ہے، اور کہیں ان میں یکسر تبدیلی اور اساسی انقلاب سے کام لیا ہے اور کہیں ان میں محض اصلاح و تطہیر پر اکتفا کیا ہے۔ وہ چار شعبے یہ ہیں: (۱) عقائد و افکار (۲) مذہبی مراسم (۳) اخلاق (۴) حقوق (اپنی جملہ انواع و اقسام سمیت)

لیکن قرآن کی ہرگونہ اصلاح و تہذیب اور انقلاب و تغیر کی مساعی میں خواہ وہ عقائد و اخلاق سے متعلق ہوں یا حقوق و اخلاق سے، ایک ہی روح جاری و ساری ہے اور ایک ہی پاکیزہ و برتر تصور کارفرما ہے۔ یہ روح اور تصور ذیل کے پانچ مبادی کا مجموعہ ہے:۔

۱۔ دعوت الی الحیاۃ،

۲۔ دعوت الی الخیر

۳۔ امر بالمعروف

۴۔ نہی عن المنکر

۵۔ مذکورہ امور کے قیام میں عقل و خرد اور تفقہ و تدبر کے رشتہ کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا۔

قرآنِ کریم نے ان مبادیٔ خمسہ کو روبعمل لانے کے لیے اور اپنے تمام اہداف و مقاصد میں ان کی رعایت کو ملحوظ رکھنے کے لیے متعدد طریقے اور گوناگوں اسالیب بیان اختیار کیے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ اس دعوت پر ایمان لائے اور اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دیا۔ قرآن نے ان کے اندر متعدد طریقوں سے نیکی کی دعوت

کی محبت اور تڑپ اس درجہ پھونکی کہ وہ اُن کا شب و روز کا وظیفہ ہوگئی، امر بالمعروف کا ولولہ اس پیمانے پر نشو و نما دیا کہ اس میدان میں اُن کے شغف و انہماک کے قصے سُن کر عقل ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتی ہے۔ منکر کے خلاف ان کے جذبات کی شعلہ فشانی اس انتہا تک پہنچادی کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن نے ان کے اندر یہ حزم و احتیاط بھی بیدار کیے رکھا کہ وہ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تمام سرگرمیوں میں اور تمام جذبات و میلانات میں قاضیٔ عقل و علم کے زیرنگیں رہیں۔ چنانچہ اس اعتدال پسندانہ روش نے ان کی کایا پلٹ کر رکھ دی اور انہیں خیرالامم کے منصب پر متمکن کیا۔

مبدأ اوّل یعنی دعوت الی الحیات کا ماخذ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ۔

اے ایمان والو! اللہ کا اور رسول کا حکم مانو جس وقت وہ تمہیں اُس کام کی طرف بلائے جس میں تمہاری زندگی ہے۔

مبدأ دوم، سوم اور چہارم کے موضوع پر قرآن کی متعدد آیات موجود ہیں، لیکن سب سے جامع آیت یہ ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔

مبدأ پنجم کے متعلق بھی قرآن کی جابجا توضیحات و ہدایات ملتی ہیں، مثلاً:

(۱) قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي۔

اے نبی ان سے صاف کہدو کہ میرا راستہ تو یہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں خود بھی پوری بصیرت اور روشنی کے ساتھ اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔

(۲) كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

(۳) كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ — اسی طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔

(۴) فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ — اہل ذکر (علماء اہل کتاب) سے پوچھ لو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے ہو۔

(۵) قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ — اے نبی آپ کہدیں کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں وہ ان لوگوں کے برابر ہو سکتے ہیں جو علم نہیں رکھتے ہیں۔

(۶) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاءَنَا۔ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ — ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کی پیروی کرو، تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہِ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟

دین کے مغربی تصور اور قرآنی تصور کا فرق | اوپر کی چند آیات سے ہمارے سامنے دو پہلو واضح ہونے ہیں۔ ایک تو ان میں اس رُوح اور مرکزی تصور کا مجمل خاکہ ملتا ہے جو قرآن کے تمام اہداف و مقاصد میں جاری و ساری ہے اور دوسری طرف یہ آیات دین کے اصل مفہوم پر روشنی ڈالتی ہیں جو دورِ حاضر کے مروجہ مفہومات دین سے کلیتہً جداگانہ اور مختلف نظر آتا ہے۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم دوسرے مباحث میں داخل ہونے سے قبل ثانی الذکر پہلو پر کچھ گفتگو کریں۔

مغربی مفکرین نے دین کی متعدد تعریفیں بیان کی ہیں۔ فرانسیسی "انسائیکلو پیڈیا آف علوم و آداب و ثقافت" میں ریلجن آرٹیکل میں اس کی جو تعریف کی گئی ہے وہ یہ ہے:

"دین کے بارے میں جس قدر تعریفات کی گئی ہیں ان سب میں عمدہ ترین تعریف گوبلٹ ڈلویلا (GOBLET DALVIELLA) کی ہے، وہ لکھتا ہے: دین اُس طریقے کا نام ہے جس کے ذریعہ

انسان عالمِ بالا کی غیبی قوتوں کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کرتا ہے"

انسائیکلوپیڈیا میں دین کی ایک اور تعریف بھی نقل کی گئی ہے:

"جیمس ڈرمسٹیٹر (JAMES DERMESTETER) کے نزدیک دین کی تعریف یہ ہے: دین ان معلومات ومحسوسات اور ان اختیارات کا مجموعہ ہوتا ہے جن کا علم وعقل سے کوئی تعلق نہیں"

لیکن جب ہم قرآن کی مذکورہ بالا چند آیات اور اسی موضوع کی دوسری لاتعداد آیات کی روشنی میں قرآن کے تصورِ دین کا مطالعہ کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام، جسے قرآن نے اپنا دین ٹھہرایا ہے[1]، ان تمام تصورات ومفہومات سے مختلف ہے جو علمائے مغرب سے منقول ہیں اور جو موجودہ زمانے کے اکثر اذہان وعقول پر چھائے ہوئے ہیں۔ اسلام جن مقاصد واہداف کا علمبردار ہے، ان کا دائرۂ اثر اپنی وسعت وہمہ گیری کے لحاظ سے ان تمام تنگ وکج اور غیر عقلی حدود سے متجاوز ہے جنہیں مغربی مفکرین نے مفہومِ دین کے اردگرد قائم کر رکھا ہے یا پہلے سے ان حدود کو متعین کر کے دین کو ان میں محصور کر دیا ہے۔

قرآن کے بیان کردہ مفہوم کی رُو سے دین نہ تو "عالمِ بالا کی غیبی قوتوں کے ساتھ تعلقات" کی چاردیواری میں محدود ہے اور نہ علم وعقل سے بے تعلق ہے۔ بلکہ وہ آفاقی وکائناتی دین ہے۔ وہ عالمِ بالا کی غیبی قوتوں کے ساتھ بھی انسان کا رشتہ استوار کرتا ہے اور "انسان کے ساتھ انسان کے تعلقات" بھی قائم ومستحکم کرتا ہے اور مزید برآں وہ اپنے ماننے والوں کو بار بار ہدایت اور تاکید کرتا ہے کہ وہ ان تعلقات کے قائم کرنے اور ان رشتوں کو مستحکم کرنے میں عقل وتدبر اور فکر وبصیرت سے کام لیں۔ اس طرح سے قرآن دینِ اسلام کو ایک مکمل نظریۂ زندگی اور ضابطۂ حیات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ نہ کہ مذہب کے اس تنگ مفہوم کے لباس میں جو مغرب میں پایا جاتا ہے یا جسے وہ تمام لوگ اختیار کیے ہوئے ہیں جو مذہب کو محض خدا اور بندے کا پرائیویٹ معاملہ سمجھتے ہیں۔

قرآن کے دینی مفہوم اور رائج الوقت مفہوماتِ دین کے مابین جو اساسی اور مرکزی فرق پایا جاتا ہے

---

[1] جیسا کہ ذیل کی آیت میں آتا ہے، جو سنہ کے آخر میں نازل ہوئی ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے

اس کی طرف آغاز بحث ہی میں توجہ مبذول کرانے کی ضرورت ہیں اس لیے محسوس ہوئی ہے تاکہ اسلامی قانون کا طالب علم پہلے ہی قدم پر تصورِ دین کے بارے میں اس عظیم غلطی سے آگاہ ہو جائے جس میں مغربی اہلِ فکر کی بہت بڑی تعداد گرفتار ہے اور وہ اسی غلط تصوّر کی وجہ سے اسلام کے نظامِ قانون کو بھی "مذہبی قوانین" کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور بلا تأمل اس پر جمود، تغیر ناپذیری اور انسانی مصالح سے بے آہنگ ہونے کا فتویٰ صادر کر دیتی ہے۔ مغربی مفکرین کے اس مغالطے کی ترجمانی پروفیسر سینٹیلانا (SANTILLANA) کے یہ الفاظ کرتے ہیں:

"یہ خیال بکثرت پھیلا ہوا ہے کہ مغرب کے قوانین اور مذاہبِ اسلام کے مابین موافقت کی سعی عبث اور لاحاصل ہے، کیونکہ اسلامی احکام و قوانین مغرب کے اصول و قواعد سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مغرب کے نظریات میں اور اسلامی قانون میں منافقت و معادات پائی جاتی ہے مزید برآں اسلامی قانون میں ارتقاء و تغیر پذیری کی صلاحیت مفقود ہے۔ اہلِ مغرب کے اس مزعومہ کی بنیاد یہ ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی قانون خاص مزاج اور فطرت کا حامل ہے یعنی وہ "مذہبی قانون" ہے۔

پروفیسر سینٹیلانا نے یورپ کی اس فاش غلطی کو محسوس کیا ہے اور اس کا پورا جائزہ لے کر اس کا رد کیا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کے مقاصد و مبادی کے باب میں ابھی ابھی ہم نے جو آیات نقل کی ہیں اسلامی شریعت کے بارے میں مغرب کی غلط فہمی اور کج فکری کا رد کرنے کے لیے صرف وہی کافی ہیں۔ قرآن نے امت کو تدبر و تفکر کی جو دعوت دی ہے اُسی کا نتیجہ ہے کہ اسلامی قانون میں اور اسلامی اصولِ فقہ میں تفقہ، تعقل اور قیاس و رائے ــــ جو اجتہاد کے مختلف نام ہیں ــــ کو باقاعدہ قانون کا ماخذ و منبع ہونے کی حیثیت حاصل ہوئی ہے۔ اور اسلامی قانون کی یہی وہ بنیاد ہے جس نے ماضی کے ہر دور میں اُسے معاشرہ کی مصلحتوں اور وقتی تقاضوں کا ہم آہنگ و حاجت روا بنائے رکھا ہے اور اسی کی بدولت اب بھی اس میں وسعت پذیری اور ارتقاء و عروج کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

قرآن کا طرزِ بیان مطالب و معانی کے بیان میں قرآن ایک مخصوص طرز اور اسلوب کا حامل ہے۔ اس کے مخصوص طرز و اسلوب سے آگاہ ہوئے بغیر جو شخص قرآن کا مطالعہ کرے گا۔ وہ قدم قدم پر آیاتِ قرآنی کے سمجھنے میں ٹھوکر کھائے گا اور آیات کے باہمی ربط و نظم کا سررشتہ ہاتھ نہ آنے کی وجہ سے وہ بین السطور

بھٹکتا رہے گا۔

آغازِ کلام میں آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کا مقصدِ اساسی معاشرۂ انسانی کی کامل و شامل اصلاح ہے جو انسان کے عقائد و اعمال اور حقوق و اخلاق کے تمام گوشوں کو محیط ہے، یہ معلوم کر لینے کے بعد ہم منطقی طور پر اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ قرآن کا اسلوب بیان اور طرزِ تعبیر بہر حال اس نوعیت کا نہیں ہو گا جو عام طور پر ہم کسی خاص فن یا کسی مخصوص موضوع کی علمی کتاب میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کا موضوع بحث صرف عقائد نہیں ہیں کہ کتبِ عقائد کے طرز پر وہ بس اعتقادی مسائل کی تشریح و توضیح تک محدود رہے۔ نہ ہی قرآن کا مدعا محض شرعی احکام کی تعلیم و تفہیم ہے کہ اس نے اپنے مباحث کا تانا بانا اس نہج پر بنا ہو جو ہم شرعی احکام و مسائل کی کتابوں میں دیکھتے ہیں، اسی طرح قرآن کا موضوعِ گفتگو فقط علمِ اخلاق یا فقط علمِ قانون تک بھی محصور نہیں ہے جس کی بنا پر ہم یہ خیال کریں کہ اس کا تحلیل و تجزیہ کا ڈھنگ بھی اسی انداز کا پابند ہو گا جو علمِ اخلاق اور علمِ قانون کی مؤلفات کے لیے مخصوص و معروف ہے۔ اس کے برعکس قرآن چونکہ معاشرۂ انسانی کی کامل و ہمہ گیر اصلاح کا علمبردار ہے، اس لیے اس کا روئے سخن پورے انسانی معاشرہ کی جانب ہے اور وہ ان تمام اصول و مبادی کو زیرِ بحث لاتا ہے جن کا تعلق معاشرے کے کسی نہ کسی گوشے سے ہوتا ہے۔ اس لیے ہماری یہ سعی لاحاصل اور فضول ہو گی، اگر ہم قرآن کی آیات میں اس طرح کا تصنیفی اور کتابی اسلوب اور اس طرز کا ربط و نظم تلاش کریں جو اس شکل میں ہو سکتا تھا جبکہ یہ صرف عقائد کی کتاب ہوتی یا اس میں محض شریعت کے احکام و مسائل کا بیان ہوتا یا یہ اخلاقیات یا قانونیات کا کوئی مجموعہ ہوتا۔ بلکہ اس خیال سے ہٹ کر ہمیں آیات کا ربط و تعلق دریافت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم سورتوں کے افتتاحی کلمات پر غور کریں۔ قرآن جب کسی سورت کا افتتاح کرتا ہے تو آغازِ کلام ہی میں وہ کسی اصولی حقیقت یا چند اصولی حقائق کا ذکر کر دیتا ہے جو دراصل آئندہ سورت میں زیرِ بحث آنے والے موضوع پر فکری اور نظری رہنمائی کر رہے ہوتے ہیں۔ ربطِ آیات کا رشتہ ہمیں انہی اصولوں کی روشنی میں دستیاب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن جب سورت کا آغاز کرتا ہے اور مطلعِ سورت میں وہ کسی اصول کو بیان کرتا ہے یا کسی نظریے کا اظہار کرتا ہے تو پھر وہ متصلاً بعد کی آیات میں اسی کی تشریح اور توضیح کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس اصول یا نظریے سے

متعلق جو اعتقادی مسائل، شرعی احکام و واجبات، اخلاقی ہدایات اور قانونی مسائل ہو سکتے ہیں ان سب پر کلام کرتا چلا جاتا ہے۔ ان تمام مباحث کا سررشتہ دراصل اُسی نظری حقیقت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے جو آغاز ہی میں پیش کی جا چکی ہوتی ہے۔ یہ ہے قرآن کا مخصوص اسلوب بیان۔ اسی اسلوب کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مستشرقین کا گروہِ کثیر اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ قرآن بے ربط اور بے جوڑ آیات کا مجموعہ ہے۔

آیاتِ احکام کا مجموعی مزاج | قرآن شرعی قوانین اور احکام کا ماخذ اول اور مصدرِ اساسی ہے۔ اس کے علاوہ جتنے ماخذ اور اصول ہیں وہ درحقیقت اسی سرچشمہ کی شاخیں اور فروع ہیں، اسی پر وہ قائم و مبنی ہیں اور ان کی حقیقت و رُوح اسی ماخذ سے ماخوذ و مستفاد ہے[1]۔ اسی وجہ سے قرآن میں جس قدر احکام وارد ہوئے ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر اصولِ عامہ اور قواعدِ کلیہ کی صورت میں ہیں جن کی قضا اور قیامِ عدل میں ضرورت پڑتی ہے یا جو اجتہاد و استنباط کے سلسلے میں رہنمائی اور روشنی فراہم کرتے ہیں[2]۔ آیاتِ احکام کا یہی وہ اصولی مزاج اور عمومی فطرت ہے جس کی وجہ سے اکثر آیات و احکام میں رسول کی تشریح اور بیان کی ضرورت لاحق ہوتی ہے چنانچہ خود ذاتِ باری تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منصب کو بیان کیا ہے:

۱- إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ۔

اے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہِ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

۲- وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔

اور ہم نے تمہاری طرف ذکر بھیجا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے۔

چنانچہ سنت قرآن کے اختصار کی تشریح، اجمال کی تفصیل اور اشکال کی تبیین کرتی ہے۔ یہی وہ ضرورت و اہمیت ہے جس نے کتاب اللہ کے پہلو بہ پہلو سنت کو ماخذِ تشریع کا درجہ دیا ہے۔

[1] ملاحظہ ہو الموافقات از شاطبی، جزء ثالث ص ۲۶۰ مطبعہ رحمانیہ، مصر۔ [2] ایضاً ص ۳۶۶ - ۳۶۸

تشریع کے باب میں قرآن کن مآخذ کو قبول کرتا ہے؟ احکام شریعت اور حقوقِ اسلامی کے باب میں قرآن نے درجۂ اول پر جس ماخذ و مصدر کو تسلیم کیا ہے وہ آیاتِ الٰہی ہیں۔ دوسرے درجہ پر وہ سنّتِ رسول کو ماخذ شمار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا آتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا — رسول جو کچھ تمہیں بتائے اُسے اختیار کر لو اور جس چیز سے منع کرے اُس سے رُک جاؤ۔

سنّت کو ماخذِ ثانی قرار دینے کے بعد ضمناً ان تمام مآخذ کو درجۂ اعتبار میں رکھتا ہے جنہیں سنّت ماخذ تسلیم کرتی ہے مثلاً اجماع اور اجتہاد وغیرہ۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اجتہاد و قیاس کا ماخذِ شرعی ہونا براہِ راست قرآن سے ثابت ہے۔ ان کا استدلال قرآن کی اس آیت پر مبنی ہے:

لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاکَ اللّٰہُ۔ — اللہ تعالیٰ نے جو راہِ راست البصیرت حق تمہیں دکھائی اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

اسی طرح اجماع کے بارے میں بھی اُن کا یہی خیال ہے کہ اس کا ماخذِ شریعت ہونا بھی از روئے نصِ قرآن ثابت ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الْھُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَھَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِیْرًا۔ — اور جو شخص رسول کی مخالفت پر کمر بستہ ہوا اور اہلِ ایمان کے راستے کے سوا کسی اور راستہ پر چلے، درآنحالیکہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہے تو اس کو ہم اُسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اُسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔

اس آیت میں سبیل المومنین (یعنی جماعت کا متفقہ راستہ) ہونے کے اتباع کو بھی لازم قرار دیا گیا ہے۔ مذکورہ مآخذ کے علاوہ قرآن عُرف (تعامل اور رواج عام) کو بھی قانون کا ماخذ تسلیم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کو حکم دیا ہے: وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاھِلِیْنَ (معروف کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو)۔ معروف میں وہ تمام رواج بھی شامل ہیں جو کسی معاشرے میں عادۃً جانے پہچانے ہوتے ہیں

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ فقہاء نے اصولِ اربعہ (کتاب اللہ، سنتِ رسول، اجماع امت اور اجتہاد) کے ساتھ ساتھ عُرف کو پانچواں مستقل سرچشمۂ قانون (اصلِ خامس) کیوں نہیں ٹھہرایا ہے۔ اور جب عرف کو ماخذِ حکم تسلیم کیا جاتا ہے تو اس کی کیا شرائط ہیں؟ پہلے جزو کا جواب یہ ہے کہ فقہاء نے عرف کو مستقل اور جداگانہ طور پر اصلِ خامس اس لیے قرار نہیں دیا کہ عرف در اصل انہیں مصالح سے عبارت ہوتا ہے جو معاشرے میں معتبر و مسلّم ہوتے ہیں۔ اور شریعت اسلامی کی اساس و بنیاد پہلے ہی سے ان مصالح کی رعایت پر استوار ہے۔ دوسرے لفظوں میں عُرف و عادت کا لحاظ و اعتبار شرعاً ناگزیر ہے جس کی شہادت خود اصولِ اربعہ میں موجود ہے۔ اگر شریعت نے اپنے احکام و قواعد کے نفاذ میں معاشرتی عادات و روایات کی مراعات نہ کی ہوتی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ انسانی مصالح معطل ہو جاتے اور شریعت انسانوں پر ایسی تکالیف کا بار لاد دیتی جو ان کی استطاعت اور قدرت سے باہر ہوتا۔ یہ بات نہ صرف شریعت کی حکمت کے خلاف اور ناجائز ہے بلکہ واقعتہً شریعت اس سے بری اور منزہ ہے۔ چنانچہ عُرف اہمیت و اعتبار کی بناء پر شریعت کی فرع اور اصولِ اربعہ کی قدرِ مشترک ہے۔ اس لیے یہ الگ اور مستقل سرچشمۂ قانون نہیں قرار پایا۔ دوسرے جزو کا جواب یہ ہے کہ تشریع و تقنین کے باب میں آئندہ عرف کو کسی حکم کا مدار و مبنیٰ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کا ٹکراؤ کسی حکم قطعی سے نہ ہوتا ہو یا اس کے اختیار کرنے سے کسی شرعی قاعدے کی نفی نہ لازم آتی ہو۔ مثلاً حُرمتِ ربا کا حکم ہے اسلام سے قبل معاشرۂ عرب میں ربا کا لین دین جاری تھا لیکن شریعت کے قطعی حکمِ تحریم کے مقابلے میں اسے منسوخ قرار دے دیا گیا (کیونکہ مصلحتِ انسانی کا یہی تقاضا تھا)۔ اسی طرح پھلوں کے آنے سے قبل ہی درختوں کی بیع کا رواج تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیع کو ممنوع قرار دے دیا کیونکہ اس کی زد اس قاعدہ پر پڑتی تھی کہ "باطل طریقے سے لوگوں کے مال کھانا جائز نہیں ہے"۔ یہ قاعدہ در اصل قرآن کے اس حکم پر مبنی ہے کہ "لَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" (تم آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ) اس عُرفی بیع کو منسوخ کر دیا کیونکہ بیع کی یہ صورت بھی باطل طریقے کی تعریف میں آتی ہے۔

سنّتِ رسولؐ

سنت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم سنّت کا لفظ سَنَّ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں بَیَّنَ (بیان کرنا) سنّتِ رسول کو اس لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ مناسبت یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کی مُبَیِّن ہے یعنی اس کی تشریح و توضیح کرتی ہے۔

علم الاصول کی اصطلاح میں سنّت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قول و فعل و تقریر ہے جو قرآنی آیات و احکام کے ماسوا آپ سے صادر ہوا ہے۔ اس تعریف کی رو سے سنّت کی تین قسمیں ہیں (۱) اقوالِ رسول (۲) افعالِ رسول، اتباع اور امتثالِ امر کے باب میں قول کی بہ نسبت فعل زیادہ تاثیر اور صراحت رکھتا ہے (۳) تقریرات۔ اس سے مراد وہ کام ہیں جو آپ کے سامنے کیے گئے یا آپ کے علم میں لائے گئے اور آپ نے کرنے والوں کو منع نہیں فرمایا بلکہ تحسین و تائید یا سکوت اختیار کر لینے سے ان کی تثبیت کر دی۔

سنت کا تعلق قرآن کے ساتھ اُمّتِ مسلمہ فرمانِ خداوندی کے بموجب سنّتِ رسولؐ کے اتباع و اطاعت کی مکلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ اسی حکمِ الٰہی کے تحت شریعتِ اسلامی نے ترتیب و اہمیت کے لحاظ سے اسے آیاتِ الٰہی کے بعد کا درجہ دیا ہے۔

مجموعی طور پر سنت کتاب اللہ ہی کے تابع ہے اور اسی کے مدعا و مقصود کی نمائندگی کرتی ہے۔ کیونکہ سنت مجموعی طور پر تین صورتوں میں سے ایک ہی صورت کے تحت ہوتی ہے۔

۱۔ یا وہ کسی اصلِ قرآنی پر تفریع ہوتی ہے جیسے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے درختوں پر پھل کے آنے سے قبل ان کی بیع و شرِ درخت کو ممنوع ٹھہرایا اور آپ کا یہ حکم قرآن کی اس اصل پر مبنی ہے کہ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔

۲۔ یا وہ کسی عام قاعدے کی تشریح اور کسی اجمال کی تفصیل ہوتی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا حکم ہے "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" یہ ایک مجمل اور عام حکم ہے۔ اس کی عملی تفصیلات و ہدایات سنّت میں وارد ہیں۔ اسی طرح یہ ارشادِ خداوندی کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ بِهَا وَتُزَكِّيْهِمْ (اے نبی! ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ) ایک مجمل حکم ہے جو تفصیلات و توضیحات کا محتاج ہے۔ چنانچہ صدقہ کی وصولی اور تطہیر و تزکیہ کی جملہ تفصیلات سنت مہیا کرتی ہے۔

رسائل و مسائل

دین میں حکمتِ عملی کا مقام

سوال :- "دین میں حکمتِ عملی کے مقام" سے متعلق ایک لمبا چوڑا مضمون رسالہ "الفرقان" لکھنؤ میں نکل رہا ہے جس کی آخری قسط تازہ الفرقان میں آچکی ہے۔ پتہ نہیں مضمون مذکور آپکی نظر سے گذر رہا ہے یا نہیں لیکن میں اس سے متعلقہ دو ایک باتوں پر آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں:

گو کہ مضمونِ مذکور سے مجھے اکثر جگہ اختلاف رہا ہے لیکن "الائمہ من قریش" اور مئی کے ترجمان میں "کیا دین کے سب ہی اصول بے لچک ہیں" والے مضمون کے تحت دی گئی ہوئی نو مثالوں پر تنقید جاندار معلوم ہوئی۔ فاضل مضمون نگار نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ کی دی ہوئی مثالیں محض شخصی اجازتیں، وقتی رخصتیں اور اضطراری وقتوں کے تحت آتی ہیں اور ان کا مساعیٔ اقامتِ دین سے کوئی علاقہ نہیں۔

مضمون کی ایک اور بات سے مجھے اتفاق ہے وہ یہ کہ گو آپ نے حکمتِ عملی والی

(بقیہ کتاب و سنت)

۴ ۔ ۳- یا وہ قرآن میں وارد ہونے والے قواعدِ عامہ اور جزئی واقعات و احکام کے تحت کسی عام اصول کو وضع کرتی ہے۔ مثلاً قرآن میں متعدد مقامات پر انسانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچانے یا ان پر دست درازی کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ سنت نے ایسے احکام و واقعات کی روشنی میں یہ عام اصول مقرر کر دیا ہے کہ لاضرر ولاضرار فی الاسلام (اسلام میں خود نقصان اٹھانا یا دوسرے کو نقصان پہنچانا جائز نہیں ہے)۔

بات چند جزئی امور جیسے "امیدواری سسٹم" اور دیگر جماعتوں سے تعاون وغیرہ کے سلسلے میں کہی ہے لیکن آپ نے جس انداز سے ان پر اسوۂ رسول سے دلائل دیئے ہیں (جو صاحب مضمون کے نزدیک تمام کی تمام غیر متعلق ہیں)، ان سے غیر سنجیدہ، مفاد پرست طبقہ کے لیے دین میں کتر بیونت کا موقعہ ہاتھ آجاتا ہے اور یہ بہت سے فتنوں کا دروازہ کھول دے گا۔ اپنے اس شبہ کے ثبوت میں مضمون نگار نے رسالہ کے اسی شمارہ میں "المنبر" کے حوالہ سے "ووٹوں کی خریدی" سے متعلق ایک عملی مثال بھی دی ہے۔ جس میں کہ ایک صاحب نے "المنبر" کے اڈیٹر صاحب کو لکھا تھا کہ حضور "تالیف القلب" کے سلسلے میں جب لوگوں کے ایمان خریدتے تھے تو اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں ووٹوں کی خریدی برحق ہے اور یہ کہ اُن صاحب کو ایک خزانہ ہاتھ آجائے تو تمام لوگوں کے ووٹ خرید کر اسلامی نظام کے قیام کی کوشش فرمائیں۔

.... فاضل مضمون نگار کا کہنا ہے کہ آپ کے حکمتِ عملی والے مضمون سے متأثر ہو کر لوگ اتنی پستی تک بھی گر سکتے ہیں تو ——— آئندہ ایسے فلسفہ کی مختلف طریقہ سے توجیہ کر کے دین کی کئی اہم قدروں کو منہدم کر سکتے ہیں۔

آپ یہ کہتے ہیں کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں توحید، رسالت اور دیگر اہم اصولوں کے استثناء سے دوسرے نسبتاً کم اہم اصولوں کو موقع کی نزاکت کے لحاظ سے قطع نظر کیا جا سکتا ہے جبکہ ان پر اصرار کرنے سے دیگر اہم اصولوں کو نقصان پہنچ رہا ہو ———

جماعت کے معترض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اگر دین کا قیام ہوگا تو اپنے پورے اصول برقرار رکھتے ہوئے ہوگا ورنہ ایسی کسی جدوجہد میں کسی بھی اصول کو قربان کیا گیا تو وہ اقامتِ دین کی جدوجہد نہیں ہے اور اگر یہ جدوجہد کامیاب ہو بھی گئی تو اسلامی نظام کے بجائے کسی کے خود ساختہ نظام کا قیام عمل میں آئے گا ...... اور اگر حالات کا دباؤ ایسا ہو بھی تو دعوتِ دین کے شیدائیوں کو چاہیے کہ دین کو اپنے تمام اصولوں کے ساتھ قائم کرنے پر مصر رہیں یا دعوتِ دین سے دستبردار ہوں۔ غرضیکہ صاحب مقالہ کا استدلال یہ ہے کہ احکام دین میں استثنا

کی گنجائش شخصی اضطرار اور ذاتی مصالح کے لیے تو ہو سکتی ہے لیکن دینی مقاصد اور دینی مصالح کی خاطر اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چونکہ مسئلہ کا تعلق "دعوتِ دین اور اُس کے طریقۂ کار" کے بنیادی امور سے ہے اس لیے بہت سے حضرات جو جماعت کے بیجا حامی ہیں نہ اس کے غالی مخالف، اس کو فی الواقع سمجھنا چاہتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کے دسمبر اور مئی والے ترجمان کے رسائل و مسائل کے تحت دیئے ہوئے جوابات پوری طرح تشفی بخش نہیں ہیں۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک مفصل مضمون جو قرآن، حدیث اور اسوۂ صحابہ کی مثالوں سے جو صرف اقامتِ دین کی جدوجہد سے علاقہ رکھتی ہوں مشرح ہو، ترجمان القرآن میں رقم کیا جائے تو جہاں یہ بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کا باعث ہوگا وہاں بہت سے تعلقِ خاطر رکھنے والے حضرات کے اضطراب کے لیے تشفی بخش ہوگا۔ جماعتی لحاظ سے ہٹ کر بھی اس کی خالص علمی لحاظ سے بھی بڑی اہمیت ہے۔

جواب ۔ "الفرقان" کی جس بحث کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کے موقع و محل اور انداز سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اصل بنائے بحث بجائے خود یہ مسائل نہیں ہیں بلکہ دل کا ایک پرانا بخار ہے جو مدتوں سے موقع کی تلاش میں دبا پڑا تھا اور اب اس کو نکالنے کے لیے کچھ مسائل بطور حیلہ ڈھونڈ لیے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ ارادہ کر کے بیٹھ جائے کہ کسی کو متہم کرنا ہے تو دنیا میں کوئی نہیں ہے جو ایسے شخص کی مار سے بچ جائے۔ آپ جس بڑے سے بڑے قدیم یا جدید مصنف کا نام چاہیں لے لیں، میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ متہم کرنے کا ارادہ کر لینے کے بعد اس کے ہاں سے کیسے کیسے سخت الزامات کی بنیادیں برآمد کی جا سکتی ہیں۔ دوسروں کو چھوڑیے، اگر خدا کا خوف اور ایک ایک لفظ پر اس کے حضور بازپرس کا خطرہ نہ ہوتا تو میں بطور نمونہ بتاتا کہ خود ان حضرات کو ضال اور مضل ثابت کر دینا، بلکہ انہیں دین اور ملت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ٹھیرا دینا کتنا آسان ہے اور آدمی تقویٰ و خشیت کا لباس زیب تن کر کے کیسی کچھ باتیں خود ان لوگوں کے خلاف بنا سکتا ہے۔

میرا قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کی تنقید میں مجھے اس طرح کے محرکات محسوس ہوتے ہیں تو میں اس کا جواب دینے سے پرہیز کرتا ہوں، کیونکہ وہ تو اپنے مقصد کی خاطر ہر وادی میں بھٹکتا پھرے گا، میں اپنا مقصد چھوڑ کر اس کے پیچھے کہاں کہاں بھٹک سکتا ہوں۔ اور آخر اس طرح کے لوگوں سے الجھ کر میں پھر اور کسی کام کے لیے وقت بھی کہاں سے لا سکتا ہوں۔ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ بعض حضرات پندرہ پندرہ سولہ سولہ برس سے مسلسل مجھ پر حملے کر رہے ہیں، اور ابھی چند سال سے تو کچھ لوگوں نے میرے خلاف الزام تراشیاں کرنا اپنا مستقل مشغلہ ہی بنا رکھا ہے مگر میں نے کبھی ان کی کسی بات کا جواب نہ دیا، یا حد سے حد اگر کبھی ضرورت سمجھی تو اپنی پوزیشن کی وضاحت کر دی اور اس کے بعد انہیں چھوڑ دیا کہ جب تک چاہیں اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرتے رہیں۔

آپ "الفرقان" اور "المنبر" کے مضامین سے اگر دھوکا کھاتے رہیں گے تو میرے لیے یہ سخت مشکل ہوگا کہ وہ آئے دن آپ کے دل میں ایک نیا وسوسہ ڈالیں اور میں اپنے سارے کام چھوڑ چھاڑ کر آپ کے وسوسے دُور کرنے میں لگا رہوں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ صبر کے ساتھ دونوں طرف کی چیزیں پڑھتے رہیں۔ اگر آپ کی سمجھ میں حقیقتِ حال آجائے تو اچھا ہے، ورنہ جہاں اور بہت سے لوگ ان وسوسہ اندازیوں کے شکار ہوئے ہیں وہاں ایک آپ بھی سہی۔

تاہم چونکہ آپ نے پہلی مرتبہ مجھ کو ان کے ڈالے ہوئے وساوس کے بارے میں لکھا ہے اس لیے میں صرف ایک دو باتوں کی وضاحت کیے دیتا ہوں تاکہ بات سمجھنے میں آپ کو مدد مل سکے۔

(۱) اختیارِ اھون کے اصول کی وضاحت میں جو مثالیں میں نے دی ہیں ان کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ان سے صرف شخصی مشکلات اور بندوں کو پیش آنے والی حاجات ہی میں اضطرار کے موقع پر رخصت کا ثبوت ملتا ہے، رہا اقامتِ دین کا کام تو اس میں اس قاعدے کے استعمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب ذرا آپ خود سوچیں کہ اگر بات یہی ہے تو رواۃِ حدیث کی جرح و تعدیل کے سلسلے میں محدثین نے بے شمار زندہ اور مردہ راویوں کی جو غیبت کر ڈالی، اس کا باعث

آخر کونسا شخصی اضطرار تھا؟ دوسری مثالوں کو تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیجیے، صرف یہی ایک مثال اس امر کے ثبوت میں کافی ہے کہ بڑے مفسدے سے بچنے کے لیے چھوٹے مگر ناگزیر مفسدے کو اختیار کر لینا، اور بڑی بھلائی کی خاطر چھوٹی بھلائی کا نقصان بقدرِ ضرورت گوارا کر جانا، صرف شخصی حاجات ہی کے لیے جائز نہیں بلکہ خالص دینی مصالح کے لیے بھی جائز ہے، اور اس قاعدے کے معاملے میں بندوں کی ضروریات اور سعی اقامتِ دین کی ضروریات کے درمیان جو فرق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ محدثین نے ہزارہا راویوں کے عیوب کی پردہ کشائی اپنے "پیشے" کی ضروریات، یا اپنی تصنیف و تالیف کے مقاصد کی خاطر تو نہیں کی تھی۔ یہ صریح حرام، بلکہ قرآن کی تعبیر کے مطابق نہایت گھناؤنا کام انہوں نے صرف اس دلیل کی بنا پر کیا تھا کہ اگر اس برائی کا ارتکاب نہ کیا جائے گا تو اس سے بہت زیادہ بڑی برائی یہ لازم آئے گی کہ دین میں بہت سی وہ باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے داخل ہو جائیں گی جو حضورؐ نے نہیں فرمائیں اور اس طرح دین کا حلیہ بگڑ کر رہ جائے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ خالصتہً اقامتِ دین کے سلسلے کا ایک نہایت اہم اور نمایاں کام نہ تھا۔ اس میں تو شخصی مصالح و حاجات کے کسی شائبے تک کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ وہ کام ہے جسے ایک قابلِ معافی جرم نہیں بلکہ کارِ ثواب سمجھ کر امت کے اگلے پچھلے تمام فقہاء اور محدثین نے بالاتفاق کیا! اور تمام امت نے بالاجماع اسے کارِ ثواب مانا، حالانکہ فی الاصل اس کے غیبت ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

(۲) دین کے کسی قاعدے کو بیان کرنے میں یہ احتمال کہ اس سے مفاد پرست لوگوں کو ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع مل جائے گا، بظاہر بڑا اہم محسوس ہوتا ہے، لیکن غور کیجیے، کیا اس اندیشے سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے اور امت کے اہلِ علم نے کسی ضروری چیز کو بیان کرنے سے اجتناب کیا ہے؟ قرآن، حدیث اور فقہ کے صفحات میں بکثرت باتیں ایسی موجود ہیں جن سے اگر کوئی جاہل اور بدنیت آدمی ناجائز فائدہ اٹھانے پر اتر آئے تو فسق و فجور اور گمراہی کی آخری حدوں کو بھی پار کر جائے۔ لیکن ان اندیشوں سے نہ خدا نے، نہ اس کے رسولؐ نے اور نہ علمائے امت نے کوئی ایسی

بات کہنے سے پرہیز کیا جو اپنے صحیح محل میں درست ہو اور جس کا بیان کرنا دین کی پیروی کرنے والے نیک نیت لوگوں کی رہنمائی کے لیے ضروری ہو۔ اب اگر وہ باتیں جو میں نے زیر بحث مضامین میں لکھی ہیں، بجائے خود درست ہیں اور ایک ایسے قاعدے کی نشاندہی کرتی ہیں جو واقعی دین میں موجود ہے، تو آپ خود سوچ لیں کہ ان لوگوں کی باتیں کیا وزن رکھتی ہیں اور مجھے ان کو کیا وزن دینا چاہیے جو ان پر مجھے متہم کرنے کے لیے یہ احتمال پیدا کرتے ہیں کہ ان امور کے بیان کرنے سے فتنوں کا دروازہ کھلے گا، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر لوگوں کے دلوں میں یہ وسوسے ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ میں خود فتنے میں پڑنے اور دین کے نام سے بے دینی کی خدمت کرنے کے لیے یہ دروازے کھول رہا ہوں۔ اس کا جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جائے اور ان لوگوں کو جو کچھ بھی یہ کہنا چاہیں کہنے دے۔

(۳) "ووٹوں کی خریداری" کے موضوع پر جو کچھ "المنیر" نے لکھا اور "الفرقان" نے اس کے صفحات سے نقل کیا، اس سے مقصود اس امر کا ثبوت بہم پہنچانا ہے کہ جس فتنے کے دروازے کھلنے کا وہ احتمال ظاہر کرتے تھے وہ تو پہلے ہی کھل چکا ہے اور میرے ہی کھولے کھلا ہے۔ یہ کرتب جو کمال درجہ تقویٰ کے ساتھ دکھائے جا رہے ہیں، میں صبر کے ساتھ ان پر خاموش ہی رہنا مناسب سمجھتا تھا، کیونکہ یہ الزام تراشیاں اور دوسرے کو متہم کرنے کے لیے یہ سرگرمیاں اور یہ تاویلیں اپنے اندر جو روح رکھتی ہیں، میں ہر وقت خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ ان کی مدافعت کی کوشش کہیں مجھے بھی اس کی چھوت نہ لگا دے۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ جیسے سادہ دل حضرات آدمی کو صبر سے خاموش بھی نہیں بیٹھنے دیتے اور ان باتوں پر جواب طلبی شروع کر دیتے ہیں۔ اب دیکھیے کہ معاملے کی اصل حقیقت کیا ہے اور پھر خود مجھے بتائیے کہ ان چیزوں کی آخر کیا جواب دہی کی جا سکتی ہے۔

پہلے "المنیر" نے مجھ پر یہ سراسر جھوٹا الزام لگایا کہ میں روپے کے ذریعہ سے ووٹ خریدنے کو جائز رکھتا ہوں اور اسے "مولفۃ القلوب" کی مد میں شمار کرتا ہوں (حالانکہ اس بیان میں صداقت کا شائبہ تک نہ تھا، یہ بات میری زبان پر آنا تو درکنار کبھی میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آئی تھی)، اور اس چیز کو "المنیر" کے

صفحات میں دیکھنے سے ایک سیکنڈ پہلے تک بھی میں نہ سوچ سکتا تھا کہ مجھ پر یہ الزام بھی کبھی لگایا جا سکتا ہے)۔ پھر اسی المنیر نے کسی دوسرے صاحب کا ایک خط شائع کر دیا جس میں وہ اپنی دانست کے مطابق ووٹوں کی اس خریداری کے حق میں کچھ دلائل پیش کرتے ہیں (اور یہ بالکل ان کا اپنا ہی فعل ہے۔ مجھ سے اس معاملہ میں نہ ان کا نہ کسی اور شخص کا میرے سے کبھی کوئی تبادلۂ خیال ہوا ہی نہیں، اور ان کے استدلال یا خیالات کا مجھ سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں ہے)۔ اس کے بعد جنابِ "الفرقان" اس سارے معاملے کو میرے سر تھوپ کر لوگوں کو یہ تاثر دے رہے ہیں کہ دیکھو، یوں اس شخص کے خیالات سے متاثر ہونے والے لوگ اخلاقی قیود کو بالائے طاق رکھے دے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ میں نے کب یہ کہا یا لکھا تھا کہ روپے سے ووٹ خریدنا جائز ہے؟ یہ ایک خالص بہتان تھا جو صاحبِ "المنیر" نے محض اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کے لیے خود ہی گھڑا اور شائع کر دیا۔ اب اگر ایک بالکل غیر متعلق شخص اس جھوٹی روایت پر اپنے کچھ خیالات پیش کرتا ہے تو کیا میں اس کی بھی جوابدہی کرتا پھروں؟ صرف یہ بات کہ وہ شخص اپنے خیالات پیش کرنے کے ساتھ میری تعریف میں بھی کچھ کلمات لکھ دیتا ہے، کیا اس کے لیے کافی ہے کہ مجھے اس کی ہر بات کا ذمہ دار ٹھیرا دیا جائے؟ یہ طرزِ مواخذہ اختیار کیا جائے تو اگلے پچھلے علماء و مشائخ اور بزرگانِ دین میں سے کون بچ جائے گا جس کے معتقدین و مداحین کی ہر غلطی اس کے سر چپک کر اُسے سرچشمۂ ضلالت ثابت نہ کیا جا سکے۔ شاید بگڑی ہوئی حکومتوں کے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر بھی لوگوں کو ماخوذ کرنے میں یہ سرگرمی اور چابکدستی تو نہ دکھاتے ہونگے۔

(۴) الائمۃ من قریش کے متعلق جو مفصل بحث میں نے رسائل و مسائل حصہ اوّل میں کی ہے اگر اسے آپ نے پڑھ لیا ہوتا تو شاید آپ "الفرقان" کی تنقید میں وہ وزن محسوس نہ کرتے جس کا اظہار آپ نے کیا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر احادیث میں کوئی چیز تو ایسی تھی جس کی بنا پر صدرِ اوّل سے لیکر شاہ ولی اللہ صاحب کے دور تک بالعموم فقہائے اسلام خلافت کے لیے قرشیت کو قانونی شرط کے طور پر بیان کرتے رہے۔ اگر حضور کے ارشادات سے یہ منشا سرے سے ظاہر ہی نہ ہو رہا ہوتا کہ آپ کے بعد خلافت قریش کے لوگوں کو دی جائے تو کیا فقہاء اتنے نادان تھے کہ محض پیشین گوئیوں کو بالاتفاق

حکم سمجھ بیٹھتے اور موجودہ دور کے بعض حضرات سے پہلے کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ یہ تو محض خبریں ہیں، ان کا منشا یہ ہے ہی نہیں کہ خلیفہ قریش میں سے ہو۔

• "الائمۃ من قریش" حکم ہے یا خبر، اس کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب کی رائے ملاحظہ ہو:

"و از انجملہ (یعنی من جملہ شرائط خلافت) آنست کہ قرشی باشد باعتبارِ نسبِ آباء خود، زیرا کہ حضرت ابوبکر صدیق صرف کردند انصار را از خلافت بایں حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ اند الائمۃ من قریش" (ازالۃ الخفاء، مقصد اول، صفحہ ۵)۔

اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ شاہ صاحب اس حدیث کے معنی ائمہ قریش میں سے ہوں گے سمجھ رہے ہیں یا قریش میں سے ہوں؟ اگر بالفرض اسے اور اس معنی کی دوسری احادیث کو لفظاً خبر ہی قرار دیا جائے تو فقہاء و محدثین نے عام طور پر اس خبر کو امر ہی کے معنی میں لیا ہے۔ بخاری کی حدیث لا یزال ھذا الامر فی قریش کے متعلق علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ "یہ حدیث مشروعیت کی خبر دیتی ہے یعنی امامتِ کبریٰ منعقد نہ ہوگی مگر قرشی کے لیے۔" ابن المنیر کہتے ہیں "اس کا مقتضیٰ حصرِ امر کا قریش میں محصور ہوتا ہے، گویا حضور نے دراصل یہ فرمایا کہ لا امر الا فی قریش، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے حضور کا یہ ارشاد کہ الشفعۃ فی ما لم یقسم"۔ اور علامہ ابن حجر فرماتے ہیں "یہ حدیث اگرچہ خبر کے الفاظ میں ہے مگر امر کے معنی میں ہے، گویا حضور کا ارشاد یہ تھا کہ خاص طور پر قریش ہی کو امام بناؤ۔ حدیث کے باقی طُرق اسی معنی کی تائید کرتے ہیں، اور صحابہ نے بالاتفاق اس کو حصر ہی کے مفہوم میں لیا بخلاف اُن لوگوں کے جو اس معنی کا انکار کرتے ہیں، اور اسی بات کی طرف جمہور اہلِ علم گئے ہیں کہ امام کے لیے قرشی ہونا شرط ہے" (فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۹۶ - ۹۷)۔

علاوہ بریں علماء کی اس رائے کا انحصار محض اُن احادیث پر ہی نہ تھا جو خبر کے الفاظ و انداز میں ہیں یا جن کے اندر محض خبر ہونے کا احتمال ہے، بلکہ متعدد احادیث امر کے الفاظ میں بھی مروی ہیں، مثلاً قدموا قریشا ولا تقدموھا (قریش کو آگے کرو اور ان سے آگے نہ بڑھو) جسے بیہقی، طبرانی اور امام شافعی نے نقل کیا ہے، اور قریش قادۃ الناس (قریش لوگوں کے لیڈر ہیں) جسے امام احمد نے حضرت عمرو بن عاص سے روایت کیا ہے۔

دراصل اس مسئلے کے متعلق مختلف الفاظ میں کثرت سے جو ارشادات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئے ہیں ان کا مجموعی اثر یہ تھا کہ علمائے اسلام صدیوں تک بالاتفاق خلافت کے لیے قرشیت کو ایک قانونی شرط کی حیثیت سے بیان کرتے رہے ہیں اور خوارج و معتزلہ کے سوا کسی نے اس معاملہ میں اختلاف نہیں کیا ہے۔ قاضی عیاض تو اس معاملہ میں اجماع تک کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"امام کے لیے قرشیت کا شرط ہونا تمام علماء کا مذہب ہے اور انہوں نے اسے اجماعی مسائل میں شمار کیا ہے۔ سلف میں سے کسی سے اس کے خلاف کوئی رائے منقول نہیں ہوئی ہے اور اسی طرح بعد کے ادوار میں بھی امصار مسلمین میں سے کہیں کے علماء نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے" (فتح الباری، حوالۂ مذکور)

اب اس کا کیا علاج کیا جائے کہ بات اطفالِ مکتب تک پہنچ چکی ہے جو بے تکلف دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ تو محض خبر تھی جس میں امر کا شائبہ تک نہ تھا۔ گویا پچھلی صدیوں میں جہالت اتنی عام تھی کہ خبر اور امر کا فرق بھی کسی کی سمجھ میں نہ آیا اور اس کے امر ہونے پر سب اتفاق کر بیٹھے اور صدیوں تک اتفاق کیے رہے! ان جسارتوں پر حال یہ ہے کہ یہی لوگ دوسروں پر الزام دھرتے ہیں کہ ان کی تحریروں سے سلف کا اعتماد و احترام ختم ہوا جارہا ہے اور عوام اس غلط فہمی میں پڑ رہے ہیں کہ دین ان سے پہلے کسی نے نہ سمجھا۔

میری رائے اس مسئلے میں اب بھی وہی ہے جس کی وضاحت میں اس سے پہلے "رسائل و مسائل" میں کر چکا ہوں، اور اب تک کوئی ایسی علمی بحث میرے سامنے نہیں آئی ہے جس سے مجھ کو اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہو۔ میرے نزدیک یہ ثابت ہے کہ حضور نے قریش ہی کو منصبِ خلافت دیے جانے کی ہدایت فرمائی تھی۔ یقیناً یہ آپ کا حکم تھا، محض پیشگوئی نہ تھی۔ مگر اس حکم کی بنیاد یہ نہ تھی کہ شرعاً خلافت ایک خاص قبیلے کا حق تھی جس کے سوا کسی دوسرے قبیلے یا نسل کا کوئی شخص اس منصب کا سرے سے مستحق ہی نہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ عملی سیاست کے نقطۂ نظر سے حضورؐ کے بعد صرف قریش ہی کی خلافت کامیاب ہو سکتی تھی جس کے وجوہ حضورؐ نے خود

اپنے متعدد ارشادات میں واضح فرما دیئے تھے۔ اس لیے آپ نے حکم دیا کہ خلافت قریش ہی میں رکھی جائے، تاکہ اسلامی نظامِ حکومت مشکلات میں مبتلا نہ ہو اور مسلمان محض اسلامی اصولِ مساوات کا مظاہرہ کرنے کے لیے کسی غیر قریشی کو خلیفہ بنا کر اُن نتائج سے دوچار نہ ہو جائیں جو ایک بااثر گروہ کے مقابلے میں کسی بے اثر یا کم اثر گروہ کے آدمی کو خلیفہ بنا دینے سے پیش آسکتے تھے۔

فقہاء اسلام نے اگر حضورؐ کے اس حکم کو مستقل دستوری قانون کے معنی میں لیا تو یہ بھی بے وجہ نہ تھا۔ حضورؐ کے بعد صدیوں تک قریش کی وہی پوزیشن برقرار رہی جس کی بنا پر آپؐ نے ابتداءً یہ حکم دیا تھا اس لیے قرناً بعد قرنٍ فقہاء اس بات کو کہ "خلیفہ قریشی ہونا چاہیے" ایک دستوری قاعدے کے طور پر بیان کرتے چلے گئے۔ لیکن حضورؐ کے وہ ارشادات اُس زمانے میں بھی کسی سے پوشیدہ نہ تھے جن سے یہ اشارہ نکلتا تھا کہ یہ حکم قریش کے ایک خاص نسل سے ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ چند اوصاف کی بنا پر ہے جو ان میں پائے جاتے تھے اور اس وقت تک کے لیے ہے جب تک ان میں اس منصب کی اہلیت باقی رہے۔ مثلاً آپ کا یہ ارشاد کہ ما اقاموا الدین (جب تک وہ دین قائم کرتے رہیں) اور ما اذا حکموا فعدلوا و وعدوا فوفوا واسترحموا فرحموا (جب تک وہ اپنے فیصلوں میں عدل کرتے رہیں اور اپنے وعدے وفا کرتے رہیں اور خلقِ خدا پر رحم کرتے رہیں)۔ یہ ارشادات خود ظاہر کر رہے تھے کہ خلیفہ کے لیے قریشی ہونے کی شرط ایک دائمی دستوری قاعدہ نہیں ہے۔ اسی بات کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سقیفۂ بنی ساعدہ میں واضح فرمایا تھا کہ ان ھذا الامر فی قریش ما اطاعوا اللہ واستقاموا علیٰ امرہٖ (یہ حکومت قریش ہی میں رہے گی جب تک وہ اللہ کی اطاعت کرتے رہیں اور اس کے حکم پر ٹھیک ٹھیک چلتے رہیں)۔ مزید براں حضرت عمرؓ نے اپنے اس قول سے کہ "اگر میری موت کے وقت ابوعبیدہ زندہ نہ ہوں تو میں معاذ بن جبل کو خلیفہ بناؤں گا" یہ بات کھول دی تھی کہ خلافت محض نسل و نسب کی بنا پر قریش کا کوئی مستقل قانونی حق نہیں ہے۔

خـــالی صفحـــه

رساله دینیات

از

سید ابوالاعلی مودودی

یه رساله هائی سکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئیے لکھا گیا ہے - اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے - مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یه رساله پڑھا دینا نہایت ضروری ہے - اس میں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں -

طلبه کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافته حضرات کے لئے بھی اس رساله کا مطالعه فائدہ سے خالی نہیں - نیز علماً بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں - کیونکه یه رساله ان کو بتائیگا که اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقه کیا ہے -

ضخامت (٢٠ × ٣٠/١٦) ١٧٦ صفحات - قیمت ١/١٢ روپیه

ادارۂ ترجمان القرآن - اچھرہ - لاہور

مطبوعه پاکستان پرنٹنگ ورکس - لاہور